ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی

عزیز لکھنوی

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ردولوی

عزیز لکھنوی

حیات اور کارنامے

یہ مقالہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نونہروی ڈی۔لٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو لکھنو یونیورسٹی کی نگرانی میں مکمل ہوا جس پر نومبر ۱۹۸۳ء میں مصنّف کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی گئی۔ مقالہ یونیورسٹی کی اجازت سے شائع کیا گیا۔

مصنّف : ڈاکٹر سیّد مسعود حسن رضوی

ناشر : ڈاکٹر سیّد مسعود حسن رضوی

طابع : نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

طبع اوّل : ۱۹۸۴ء مطابق ۱۴۰۴ھ ہجری

تعداد اشاعت : چھ سو ۶۰۰

قیمت : پینتالیس ۴۵ روپے 45=00

مِلنے کے پتے :-

۱۔ سید محمود حسن کامران ۱۸۷/۲۔ فراش خانہ۔ وزیر گنج، لکھنؤ

۲۔ نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

۳۔ نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ

۴۔ دانش محل۔ امین آباد۔ لکھنؤ

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط
شہیدِ جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط
(اکبر الہ آبادی)
AZIZ LUCKNAVI
1882 — 1935
در بزمِ ذوق و شوق عزیزِ غزل طراز + سازِ آنچناں نواخت کہ جانِ سخن گداخت
آں گریہ را کہ بود گرہ در ضمیرِ عشق + آہے درونِ نالۂ او روانہ ساخت
— علامہ اقبال

اِنتساب

محترم والدین کے نام
جو اِس کتاب کے تکملہ کی حسرت
اور
مجھے ڈاکٹر کی حیثیت سے دیکھنے کی
تمنّا لے کر
عین اُس وقت
عالمِ بقا کو سدھار گئے
جب اُن کی آرزو پُوری ہونے میں
چند ہی ماہ رہ گئے تھے۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومتِ اُتّر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

چودھری سید علی محمد زیدی
ارشاد منزل ردولی۔ بارہ بنکی

مصنف کا تعارف۔ ایک اقتباس

سید مسعود حسن رضوی۔ والد کا نام قاضی سید منظور حسن ہے جن کے اجداد قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے جو یہاں قرابت کے سلسلے میں آکر آباد ہو گئے۔ چونکہ وہاں شاہی زمانہ میں قاضی کا عہدہ تھا اور شرعی فیصلے کیا کرتے تھے اس رعایت سے قاضی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا مکان محلہ صوفیانہ میں آبادی کے بالکل آخری حصہ میں ہے۔ قاضی صاحب کو مرثیہ پڑھنے کا بیحد شوق ہے اور اوقات فرصت میں زیادہ وقت مرثیہ پڑھنے اور لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور اس شوق کی وجہ سے لڑکوں میں بھی مرثیہ پڑھنے کا دلولہ بچپن ہی سے پیدا ہو گیا ہے۔

مسعود کی ولادت ۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ پانچویں سال بسم اللہ کی رسم مولوی ابن حسن نونہروی نے مسجد ارشاد حسین میں کرائی۔ اس کے بعد پرائمری اسکول کی تعلیم کا تکملہ کر کے جونیر ہائی اسکول ۱۹۵۱ء میں اور ہائی اسکول ۱۹۵۳ء میں پاس کیا۔ والد کی محدود آمدنی، پانچ چھ نفر کا خرچ اسکا احساس مسعود کو اچھی طرح سے تھا لہٰذا ۱۹۵۴ء میں محکمہ تعلیم ضلع پرشید میں ملازمت کر لی مگر تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ اور تعلیم کے تکملہ کا خیال ہمہ وقت رہتا۔ لہٰذا ملازمت و تعلیم دونوں دوش بدوش چلتی رہیں۔ انٹر کیا پھر ۱۹۶۲ء میں

آگرہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ بی۔ اے اور ۱۹۶۵ء میں ساکیت ڈگری کالج فیض آباد میں بی۔ ایڈ کلاس میں داخل ہو کر ۱۹۶۶ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں کامیاب ہوئے۔ پہلی تقرری نارمل اسکول سیکنڈری ضلع لکھنؤ میں ہوئی اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں انگریزی معلم کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا۔ اور اس وقت تک اسی کالج میں ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ اس وقت مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی حیات اور فن پر پی ایچ۔ ڈی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی ڈی۔ لٹ۔ صدر شعبۂ اردو کے زیر قیادت کر رہے ہیں۔ مسعود کو یہ فخر حاصل ہے کہ باپ نے تعلیم کی ابتدا کرائی اور انشاء اللہ بیٹا اس کا تکملہ کرائے گا۔

مسعود میں ابتداء ہی سے بزرگی کی جھلک نمایاں تھی اور جب چار پانچ سال کے سن میں سلام پڑھنے کے لئے ممبر پر جاتے تھے اور یہ مصرعہ پڑھتے۔

؎ جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

تو باقاعدہ ممبر کے آخری زینہ پر سر رکھ کر آنکھ بند کر لیتے اور دونوں ہاتھ پھیلا دیتے تھے۔ دس سال کے سن تک والد کی انگلی پکڑ کر چلتے تھے چنانچہ اسکول کے ایک فنکشن میں لڑکوں نے قاضی صاحب کے چلنے کا انداز چھڑی ہلانے کا طریقہ اور مسعود کے انگلی پکڑنے کو اس خوبصورتی سے ادا کیا تھا کہ تماشبینوں ہی نے نام کا اعلان کر دیا۔

بچپن سے ابھی نکلے ہی تھے کہ نوکری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بزرگی کے آثار ظاہر کرنا بھی ضروری تھا لہذا جب کوئی شاگرد سلام کرتا تھا تو جواب میں

"جیتے رہو" کہتے تھے۔ اگرچہ یہ لفظ زیادہ وزنی ہو جاتا تھا مگر کبھی بزرگی کے وقار میں کمی نہ آنے دی۔ اور یہ سلسلہ دن بدن ترقی ہی کرتا گیا۔ جون ۱۹۶۹ء میں شادی ہوئی۔ ایک سال کے اندر صاحبِ اولاد ہوئے۔ اب تو قدرت کی طرف سے بزرگی کا سرٹیفکٹ مِل گیا اور اس میں خدا کے فضل اور بزرگوں کی دعاؤں سے ترقی ہے۔

مسعود کو زمانۂ طالب علمی اور ابتدائی زمانۂ ملازمت میں جو ردولی میں گزرا آزادی سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ والد کی سخت قیود، ان کی اطاعت اور فرمانبرداری، مزاج کی سنجیدگی اور متانت نے عدول حکمی کا خیال بھی دل میں نہ آنے دیا۔ جب ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ میں رہنے لگے اُس وقت لطفِ دنیا حاصل کرنے کا اچھا موقع تھا مگر پاؤں میں ایسی قدرتی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے ایک قدم بھی ہلانا دشوار تھا۔ لہٰذا صبر و ضبط سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے دنیا کی رنگا رنگی سے منہ موڑا اور آخرت میں کام آنے والی چیزوں کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ نماز روزہ کے بے حد پابند ہیں نمازِ جماعت کے شائق ہیں۔ سُسرالی بھی عرصے سے لکھنؤ ہی کے مستقلاً باشندہ ہیں۔ جن پر لکھنؤ کی تہذیب، مذہبی انہماک و عزاداری کی پوری پوری چھاپ ہے۔ اور اس بہترین ماحول کا مسعود کے بچوں پر پورا پورا اثر پڑا ہے۔

مرثیہ تو بچپن ہی سے پڑھا کرتے تھے اب شاعری کی طرف خاص توجہ ہے۔ سلام رُباعی اور قطعہ خود کہتے ہیں اور بہت ہی انکساری کے ساتھ مجبر یہ دبی زبان سے اپنے کلام کا اظہار کرتے ہیں۔ اب مرثیہ کہنے کا بھی شوق پیدا ہو چلا ہے جو انشاء اللہ جلد پورا ہو گا"۔ (از اپنی یادیں ردولی کی باتیں" صـ ۳۵۲)

مصنّف چودھری سیّد علی محمّد زیدی۔ ارشاد منزل ردولی ضلع بارہ بنکی۔ سنِ طباعت ۱۹۷۵ء

عزیز لکھنوی

حیات اور کارنامے

فہرست موضوعات

باب اول

حالات زندگی

باب دوم

ماحول۔ سلسلۂ شعروفن اساتذہ و تلامذہ

باب سوم

عزیز کی شاعری

باب چہارم

عزیز بحیثیت نثر نگار :-

باب پنجم

عزیز کا نظریۂ شعر و فن

نمونۂ کلامِ غیر مطبوعہ

مآخذ

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب نونہروی
پروفیسر صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

پیش لفظ

عزیز لکھنوی کے متعلق زیر نظر مقالہ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کی طویل ریاضت و جستجو کا خوشگوار ماحصل ہے۔ اسی تحقیق کے سلسلہ میں انھیں لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض کی گئی ہے۔

عزیز لکھنوی کی اہمیت اور اکتسابات کے متعلق اس پیش لفظ میں کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ اس صدی میں جن شعراء اور ادباء نے لکھنؤ کے ادبی نقطۂ نظر کو ایک نیا موڑ دیا اور یہاں کے ادب کو مجموعی طور پر انیسویں صدی کو عبور کر کے محض زمانی اعتبار سے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی بیسویں صدی میں قدم رکھنے میں مدد دی عزیز اس پورے کارواں کی ایک نہایت نمایاں فرد تھے۔ اُن کی شخصیت بہت گوناگوں تھی۔ ادب کے مختلف اصناف پر وہ ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی مجموعی علمی استعداد بھی شعری اور ادبی ضروریات کے مقابلہ میں فراواں تر تھی۔ انھوں نے روایت کا تحفظ بھی اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ کیا کہ جتنی بالغ نظری کے ساتھ جدید عہد اور تقاضوں کی تکمیل کی۔ انھوں نے کشادہ ذہن کے ساتھ معاصر حقیقتوں کا زرخیز ادراک کیا اور ماہرانہ طریقہ سے فن کی آرائش نو کی۔ اُن کی غزلیں اس نئے تفکر اور نئی معنویتوں سے مالامال ہیں۔ جن سے لکھنؤ کا ارتقائی سفر عبارت ہے۔ انھوں نے اس بے مثال ادراک اور ابلاغ و اقدار کے مسائل پر گہری

نظر اور گرفت کی بنا پر نہ صرف ادبی تاریخ میں اپنے لئے نمایاں مقام حاصل کیا بلکہ مجموعی طور پر ایسا ادب پیدا کیا جو دائمی اہمیت اور بدلتے ہوئے پس منظر میں بھی اپنی جاذبیت کو برقرار رکھنے کا اہل ہے۔ عزیز لکھنوی نے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن جو کچھ عمرِ عزیز کا حاصل چھوڑا وہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے عمرِ جاوداں کا بدل ٹھہرائے جانے کا مستحق ہے۔

افسوس یہ ہے کہ عزیز لکھنوی کا مطالعہ تفصیل اور باقاعدگی کے ساتھ ابھی تک نہیں ہوا۔ وسیع تر مطالعہ اور ان کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے راہ ہموار کرنا ایک ایسا فرض تھا جو اس مقالہ کی مدد سے بہت تاخیر کے ساتھ ادا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی نے بہت سلیقہ اور اعتماد کے ساتھ اس مرحلہ کو سر کیا ہے۔ انھوں نے تحقیقی آداب کو بہت اچھی طرح ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی فکر میں نہ تو شکوک کے پیدا کردہ ابہامات ہیں اور نہ غرور و سرورِ تحقیق کی آوردہ ادعائیت ہے۔ ان کا یہ مقالہ نہ تو عزیز کے سلسلہ میں حرفِ آغاز ہے اور نہ حرفِ انجام بلکہ جہانِ عزیز کا ایک ایسا علمی مشاہدہ ہے جو عزیز کے متعلق نئے فکری جہات کا دروازہ کھولتا ہے۔ اُن کا کام اطمینان بخش جامعیت کے ساتھ ساتھ مزید غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو اس دورِ انحطاط میں اکثر مقالوں میں نظر نہیں آتے ہیں۔

مجھے وثوق ہے کہ اس مقالہ کا اردو کے علمی اور تحقیقی حلقوں میں وسیع پیمانہ پر خیر مقدم کیا جائے گا اور ادب کے جوہری اسے تحسین کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

شبیہہ الحسن

۱۰ دسمبر ۱۹۸۴ء

محمد امیر حیدر خاں صاحب
مہاراجکمار آف محمود آباد اسٹیٹ
ضلع سیتا پور

اظہارِ عقیدت

کہاں گئے وہ اہلِ کمال جن کی صحبت سے بزمِ ہستی میں چہل پہل تھی، جن کی دلکش صداؤں کو سننے کے لئے کان ترستے ہیں اور جن کے آدابِ نشست و برخواست تہذیب و تمدن کے نمائندہ تھے؟ افسوس کہ ہم نے جیتے جی ان کی قدر نہ کی اور آج ان کی قبروں کے نشان بھی مٹے جا رہے ہیں۔ جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی سے مجھے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا، ان کے شاگردوں میں نواب جعفر علی خاں اثرؔ اور شبیر حسن جوشؔ ملیح آبادی کی سی ہستیاں مشہور و معروف تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ء میں جب میں نے اپنا پہلا سلام رات کو جاگ کے نظم کیا تھا اور ماچس کے تنکوں سے تنکیے کے غلاف پر لکھ کر محفوظ کیا تھا تو اس پر عزیزؔ صاحب مرحوم نے نظر ڈال کر اسے منبر پر پڑھنے کے لئے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد عزیزؔ صاحب پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مع اپنی اہلیہ اور کمسن بچوں کے لکھنؤ لائے گئے اور یہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اِس سال ان کی بیوہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ رہے نام اللہ کا۔ جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب ایم اے

نے برسوں کی محنت کے بعد جناب عزیز صاحب مرحوم پر یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اور اِس میں مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بے شمار ذرائع سے مواد فراہم کیا ہے۔ کیا عجب جو یہ مجموعۂ علمی و ادبی اہلِ ذوق و ادب اردو کے لئے ایک گراں قدر ذخیرہ ثابت ہو اور تذکرہ نگاری کے اِس میدان میں ایک اچھوتا اضافہ قرار پائے جن میں خود جناب عزیز صاحب مرحوم کی کتاب "تجلیات" ایک مثالی نمونہ (CLASSIC) ہے۔ ہر چند تحقیق و تدقیق کے بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی نے بجا بجا مؤلف کتاب کے قلم کی عناں گیری اِس طرح کی ہے کہ طبیعت کو سیری نہیں ہوئی لیکن اس کے نتیجہ میں جو کچھ اِس میں درج ہو گیا ہے وہ معتبر و مستند ہے۔ محض "زیبِ داستاں" کرنے کی ہوس نے مزید اضافوں کو روک کر شواہدِ مسلّمہ کی بنیادوں پر اِس کارنامے کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کر دیا ہے۔

خدا کرے یہ قلمی خدمت اردو کے لیے ایک نقشِ دلنشیں ثابت ہو۔

محمد امیر حیدر خاں
محمود آباد ہاؤس قیصر باغ۔ لکھنؤ
اپریل ۱۹۸۴ء

ابتدائیہ

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ہندوستان کے اردو شعراء میں جناب عزیزؔ لکھنوی کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ غزل، قصیدہ، نظم، قطعہ بلکہ تمام اقسام نظم میں آپ کے کلام کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جسے پرکھنے والی نگاہیں نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے کمالات کا تشفی بخش تعارف اب تک نہیں ہو سکا اور اسی لیے ان کی تنوع پسند طبیعت کے متعلق واقفیت بالعموم بہت محدود رہی۔ عام طور سے وہ غزل اور قصیدہ کے شاعر مانے جاتے ہیں جب کہ انھوں نے نظم، قطعہ، رباعی، سلام اور مرثیہ وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے، ایسے حضرات کی تعداد تو اور بھی کم ہے جو یہ بھی جانتے ہوں کہ عزیزؔ نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے تاریخ و سوانح نگاری بھی کی، لغت بھی مرتب کیا۔ ادبی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے اور کارہائے ادارت بھی انجام دیئے۔ عزیزؔ تنقیدی

صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ شعر کے بارے میں ان کا نظریہ ایک تاثراتی بنیاد رکھتا ہے جس میں حکیمانہ رنگت بہت نمایاں ہے۔ جتنے زیادہ اصنافِ نظم ونثر پر عزیز نے حسن وخوبی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے اردو شعروادب میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ پھر بھی ان کو وہ شہرت نہیں نصیب ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ ان کی حیات اور ادبی خدمات پر ابھی تک کوئی مبسوط مقالہ منصۂ شہود پر نہ آسکا۔ زیرِ نظر مقالہ اسی صاحب طرز شاعر اور نثر نگار کی حیات اور فن پر روشنی ڈالنے کی ایک حقیر کوشش ہے۔

عزیز کی حیات اور فن پر تفصیلی نظر ڈالنے کے لیے مقالہ کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں جن باتوں کے متعلق حتی المقدور مستند معلومات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

عزیز کا شجرہ، وطن، مورث اعلیٰ کا شیراز سے کشمیر اور کشمیر سے لکھنؤ آنا۔ عزیز کی ولادت اور تعلیم وتربیت، ان کے اساتذہ کا علمی مرتبہ عزیز کی ازواج اور آل اولاد۔ عزیز کا سراپا۔ خوراک، پوشاک اخلاق وعادات، ذریعہ معاش اور وفات۔ بعد وفات عقیدت کے نذرانے جو قدر شناسوں نے نظم ونثر کی صورت میں پیش کیے۔ نیز عزیز کی تاریخ وفات میں جو اختلافات نظر سے گذرے ان کا تجزیہ اور صحیح تاریخ وفات۔ عزیز کی زندگی کے حالات جو ان کے اعزاء واحباب بالخصوص بیوۂ عزیز اور ان کی بیٹی وداماد سے براہ راست فراہم ہوئے اس ضمن میں بہت سے ایسے حالات ہیں جو ہنوز دسترس میں نہیں تھے۔

دوسرے باب میں لکھنؤ کے اس تہذیبی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے جس سے عزیز کا فن نمودار ہوتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی زندگی کے اثرات مغربی تہذیب کی گرفت۔ پرانی اور نئی قدروں کی آویزش اور اس کے نتائج اردو ادب کے وہ رجحانات جن کو عزیز کے عہد کی مجموعی سیاسی اور سماجی فضا نے پیدا کیا تھا۔ اسی باب میں عزیز کے ان تین اساتذہ کا بھی ذکر ہے جن سے عزیز نے مشورہ سخن کیا اور اسی سلسلہ میں ثبوت و اسناد کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے کہ عزیز کو صفی سے تلمذ تھا۔ شاگردانِ عزیز کا مختصر تعارف اور نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے کچھ شاگردوں کے حالات اور کلام کے نمونے نہیں مل سکے ہیں اس لئے صرف ان کے نام دیدیئے گئے ہیں اور اسی ضمن میں شاگرد بنانے کے آداب و شرائط، درستی کلام کے طریقے اور اصلاح کے نمونے بھی فراہم کئے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں عزیز کی شاعرانہ صلاحیت کو واضح کیا گیا ہے۔ غزل، قصیدہ اور نظم کے خصوصی جائزے کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں عزیز کی فنی مہارت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پہلی مرتبہ ان کی تاریخ، رباعی، سلام، مرثیہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے مختلف اصناف سخن میں عزیز نے اصلاح کی جو جدوجہد کی ہے اسے بھی واضح کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں عزیز کی نثر نگاری پر بحث کرتے ہوئے انکی تصنیفوں کا الگ الگ تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں ان اساتذۂ نثر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے عزیز متاثر ہوئے۔ عزیز کے پینتالیس مضامین بھی مختلف رسالوں سے جمع کر لئے گئے ہیں اگر خدا نے چاہا تو جلد ہی زیورِ طبع

سے آراستہ ہو کر سامنے آئیں گے۔

پانچویں باب میں آرٹ اور فن کے متعلق عزیزؔ کے تصورات اور تنقیدی شعور پر بحث کی گئی ہے۔ جن شعراء کے کلام پر عزیزؔ نے تنقید کی ہے ان کے نام اور تنقید کے کچھ نمونے بھی پیش کر دیئے گئے ہیں۔

لکھنؤ میں گھوم پھر کر حالات و واقعات جمع کرنے کے بعد محمود آباد (سیتاپور) الہ آباد، علی گڑھ اور رام پور کا سفر کیا اور عزیزؔ کے احباب و تلامذہ سے (جن کی تعداد بہت زیادہ ہے) مل کر معلومات حاصل کیں اسی لئے آخر مقالہ میں شخصیات کے عنوان کے تحت ان سب حضرات کے اسمائے گرامی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں ان تمام حضرات کا صد درجہ شکر گذار ہوں۔ افسوس کہ ان میں بہت سے حضرات میرے شکریے سے مستغنی ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں۔

عزیزؔ کی حیات اور فن کے متعلق کتب، رسائل اور اخبارات کی چھان بین بھی برابر جاری رہی۔ لکھنؤ کے متعدد مدارس اور کالجوں کے کتب خانوں میں حاضری دی۔ پھر اسی شہر کی ناصریہ لائبریری ــــ گنگا پرشاد میموریل لائبریری، امیرالدولہ پبلک لائبریری اور لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد ساکرٹیز (Socrates) لائبریری محمود آباد (سیتاپور) الہ آباد یونیورسٹی لائبریری اور رضا لائبریری رام پور سے مستفیض ہوا۔ تلاش و جستجو کے دوران کچھ اور بھی گرانقدر چیزیں دستیاب ہوئی ہیں جو انشاءاللہ کتابی صورت میں بہت جلد جنت نگاہ بنیں گی۔ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ سے عزیزؔ کی بیشتر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفیں حاصل ہوئیں جن سے کافی مدد ملی۔ غیر مطبوعہ ذخیرہ

میں "نشانات احباب"، کا ایک رجسٹر "پسندیدہ اشعار" کی ایک ڈائری اور "سبد گل" کی ایک مجلد کاپی محفوظ ہے۔ یہ عنوانات عزیز نے خود اپنے قلم سے تحریر کئے ہیں "نشانات احباب" کے نام سے جو رجسٹر ہے اس میں عزیز نے خط و کتابت کے لئے ایک سو سولہ پتے لکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دائرۂ احباب کتنا وسیع تھا جو ہندوستان سے لندن تک پھیلا ہوا تھا۔ "پسندیدہ اشعار" ایک ڈائری کی شکل میں ہے جس کی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ہے، اس میں عزیز نے کلام اساتذہ سے اپنی پسند کے اشعار انتخاب کئے ہیں جن کی تعداد ایک سو سات تک پہونچتی ہے۔ "سبد گل" ۲۰×۲۷/۸ کی تقطیع پر ایک سو چھتیس صفحات کی ایک مجلد کاپی ہے جس میں عزیز نے مختلف حضرات کی ولادت، شادی اور وفات کے علاوہ بعض اخبار کی رسم اجرا وغیرہ کی تاریخیں نظم کی ہیں۔ اس ذخیرہ کے علاوہ ارشاد منزل ردولی بارہ بنکی سے رسالہ الواعظ لکھنؤ کے دو تمام شمارے حاصل ہوئے جو عزیز کی ادارت میں نکلے تھے اور اس مقالہ کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ مقالہ کے آخر میں ان کتابوں رسالوں اور اخباروں کی ایک فہرست دے دی گئی ہے جن سے براہ راست یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہے۔

میں جناب امیر حیدر خاں صاحب بھارا جکمار آف محمود آباد جناب سید علی محمد صاحب زیدی ارشاد منزل ردولی ضلع بارہ بنکی اور سید جمیل الحسن صاحب منیجر نسیم بکڈپو لکھنؤ کا شکر گذار ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر حتی الامکان میرے کام میں دلچسپی لی اور گرانقدر تعاون فرمایا۔ تحقیق و تدقیق اور مواد کی فراہمی میں میرا حوصلہ پست

ہو جاتا اگر پروفیسر سید شبیہ الحسن صاحب نونہروی جن کی نگرانی میں یہ مقالہ مکمل ہوا اپنے مفید اور مخلصانہ مشوروں سے مستفیض نہ کرتے اور قدم قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی نہ فرماتے جس کا شکریہ ادا کرنا تو میرے حیطۂ امکان سے باہر ہے مگر اتنی دعا ضرور ہے کہ خدا ممدوح کو تا دیر سلامت رکھے اور تشنگان علم و ادب موصوف کے فیوض و برکات سے سیراب ہوتے رہیں۔

مقالہ کی تیاری میں صرف مستند اور معتبر مآخذ اور ذرائع سے ہی کام لیا گیا ہے اور جن حالات و واقعات کی تصدیق نہیں ہو سکی ان کو یا تو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا شک کا اظہار کر دیا گیا ہے پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کہ مقالہ میں کوئی فروگذاشت نہ ہوئی ہوگی یا یہ مقالہ عزیز کے سلسلے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید مسعود حسن رضوی

باب اول

حالاتِ زندگی

عزیز کے اسلاف عزیز کے مورثِ اعلیٰ مرزا محمد جعفر شیرازی تھے جن تک عزیز کا سلسلہ اس طرح پہونچتا ہے :-

مرزا محمد ہادی عزیز ابن مرزا محمد علی ابن مرزا محمد صادق ابن مرزا محمد مہدی ابن مرزا محمد کاظم ابن مرزا محمد جعفر شیرازیؒ[1]۔ عزیز کے بڑے بھائی مرزا محمد مہدی اپنے والد کے حالات لکھتے وقت اپنے اسلاف پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :-

"یہ (مرزا محمد علی) فاضل ادیب منشی مقدس متقی تھے۔ تیرھویں رجب کی شب میں سنہ ۱۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے[2]۔ یکم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۹ھ

---

[1] دیباچہ گلکدہ ص۲

[2] اپنی تصنیف "دوحۃ الانوار" میں مرزا محمد علی خود لکھتے ہیں: "تیرھویں رجب سنہ ۱۲۶۰ھ کی شب کی دو گھڑی گذرنے کے بعد میری پیدائش ہوئی۔

میں بخار اور کھانسی کی شکایت میں انتقال کیا اور امام باڑہ غفرانمآب میں دفن ہوئے۔ میں نے اِن کی زبان سے بارہا سنا ہے کہ میرا نسب جناب مالکِ اشتر نخعی تک پہونچتا ہے جو صحابیٔ خاص حضرت علیؑ تھے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ میرے دادا کے دادا مرزا محمد کاظم شیراز سے کشمیر تشریف لائے اور میرے دادا مرزا محمد صادق اپنے ماموں مرزا علی رضا خاں کے حسبِ طلب جوانی کے عالم میں نصیر الدین بادشاہِ اودھ کے زمانۂ حکومت میں لکھنؤ تشریف لائے۔ مرزا موصوف نے ان کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے کشمیر سے بلایا تھا۔ اپنے ماموں کے یہاں تھوڑے دنوں تک مقیم رہے لیکن جب معلوم ہوا کہ ان کے یہاں غیر شرعی محافل منعقد ہوتے ہیں تو اپنے زہد و ورع و تقدس کے سبب سے ...... دوسرے مقام پر قیام کیا کبھی نمازِ تہجد اُن سے نہیں چھوٹی تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ روزانہ نمازِ شب اور وقتِ نمازِ صبح قرآن مجید پڑھا کرتے تھے حد یہ ہے کہ مرض کی شدت میں بھلا نہ کبھی نمازِ شب چھوٹی اور نہ تلاوتِ قرآن مجید ۲۸ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ میں تلاوتِ قرآن مجید کے بعد وفات پائی۔ میرے والدِ مرحوم نے اساتذۂ عظام زمانہ اور علمائے کرام سے درس حاصل کئے۔ جیسے جناب سلطان العلماء سید محمد صاحب قبلہ سے فقہ، جناب مفتی محمد عباس صاحب سے ادب اور جناب آیت اللہ فردوس مآب علامہ سید حامد حسین صاحب قبلہ سے تفسیر و حدیث اور راجہ امداد علی صاحب

کنتوری سے علوم فلسفہ و حکمت پڑھے تھے جناب فردوس مآب صاحب قبلہ کتاب "نجوم السماء فی تراجم العلماء"، جو انھیں کے ایماد اشارے سے لکھی گئی تھی اس کی تقریظ میں فرماتے ہیں: "فاضل سعید ذی رشید۔ صفی حمید المسعی، ذکی لوذعی مولوی مرزا محمد علی اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے علم و فضل میں سبقت حاصل کی ہے اور تحقیقات کو مستحکم کیا ہے اور علم کو مضبوط طریقہ سے حاصل کیا ہے اور بڑے بڑے علمائے اعلام سے علم و فن کی تکمیل کی ہے علم حاصل کرنے میں سابق کے بزرگ علماء کے نقش قدم پر چلے۔ وہ مجھ سے قدیم زمانہ سے محبت کرتے تھے۔ میرے معتمد اور موثقین میں داخل تھے انھوں نے میری خواہش سے علماء کے حالات پر یہ کتاب لکھی۔"[1] ان کے مصنفات میں حسب ذیل یہ کتابیں ہیں:۔

۱۔ نجوم السماء فی تراجم العلماء

۲۔ زعفران زار (شعرائے کشمیر کے حالات میں یہ کتاب مسودہ کی حالت میں ہے)

۳۔ کشکول (جس کا نام "روضتہ الازہار و دوحت الانوار" ہے۔ جس میں عربی خطوط، علمی فوائد اور دوسری چیزیں جمع کی ہیں)

۴۔ مجمع الفوائد[2]

عزیز نے اسی کتاب[2] میں اپنے والد کا قطعۂ "تاریخ وفات خود" اپنے

---

[1] ترجمہ تکملۂ نجوم السماء، از مرزا محمد مہدی ص ۱۴۲ (یہ کتاب فارسی میں ہے۔ مرقومہ بالا اقتباس کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا گیا ہے)

[2] نجوم السماء فی تراجم العلماء

ہی قلم سے درج کیا ہے جو اس طرح ہے :۔

رفت چوں سایۂ پدر ز سرم — تیرہ شد روزگار در نظرم
ہست ایں نوحۂ عزیز حزیں — ز سرم رفت سایۂ پدرم (۱۳۰۹ھ)

کتاب "نجوم السماء فی تراجم العلماء" عرصہ ہوا مطبع جعفری نخاس جدید میں مصنف کے بڑے فرزند مرزا محمد مہدی نے چھپوائی تھی، یہ کتاب نایاب ہو گئی تھی مگر حجت الاسلام علامہ سید شہاب الدین مرعشی نجفی نے مولانا سعادت حسین[۱] صاحب کی معرفت چھپے ہوئے نسخہ کا عکس تحریر لکھنؤ سے منگوا کر مکتبۂ بصیرتی قم۔ ایران سے ۱۹۷۵ء میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ[۲] لگانے کے لئے یہ کافی ہے کہ حجت الاسلام نے اِس کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی۔

عزیز کی ولادت عزیز کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۳۰۰ھ[۳] (۴ فروری ۱۸۸۲ء) کو ہوئی۔ جس گھر میں ولادت ہوئی وہ کٹرہ جہانگیر خاں واقع گلی محمد شاہ محلہ نخاس میں تھا۔ بعد میں یہ مکان شہر کی اسکیم میں آ گیا اور اس طرف سے سڑک نکالی گئی۔ نخاس (لکھنؤ) کے چوراہے سے امین آباد جانے والی سڑک پر چلتے ہی لکھنؤ فارمیسی ہے اسی جگہ پر گلی محمد شاہ تھی جہاں داہنی طرف یہ مکان تھا گویا لکھنؤ فارمیسی کے سامنے جو حصہ آج سڑک ہے[۴]

۱؎ پرنسپل شیعہ عربک کالج لکھنؤ

۲؎ نبراس النور والضیا فی ترجمۃ مؤلف نجوم السما، مصنفہ حجت الاسلام علامہ سید شہاب الدین مرعشی نجفی۔

۳؎ دیباچہ گلکدہ ص۲

۴؎ یہ واقعہ غالباً ۱۹۱۳ء کا ہے ۲۷ اپریل ۱۹۱۳ء کو اکبر الہ آبادی عزیز کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"آپ کا گھر سڑک میں آ گیا عجیب اتفاق ہے تھوڑا زمانہ گذرا میں نے ایک مطلع کہا تھا سہ

تنگ دنیا سے دل اس دورِ فلک میں آ گیا — جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آ گیا" (مکاتیب اکبر)

یہی کبھی عزیز کا مکان تھا۔ مکان کے معاوضہ سے خود عزیز نے نخاس کے آگے وکوریا گنج چوراہے کے پاس دین دیال روڈ پر محلہ اشرف آباد میں مکان خرید لیا جس کا نام عزیز منزل رکھا، یہ مکان پختہ اور مضبوط حالت میں ہے۔ عزیز کے بڑے بیٹے ابو محمد مرحوم نے اسے فروخت کر دیا اور عزیز کے ورثاء سے اس کا اب کوئی تعلق باقی نہیں ہے۔

برادران و ہمشیرگان عزیز

عزیز کے صرف ایک ہی بھائی مرزا محمد مہدی تھے۔ یہ عزیز سے بڑے تھے ان کا نام اوپر آچکا ہے۔ جید عالم اور حکیم حاذق تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ عزیز کی دو بہنیں تھیں۔ ایک کا نام آمنہ بیگم تھا اور دوسری کا کنیز حسین۔ آمنہ بیگم کی شادی مرزا الطاف حسین عالم لکھنوی کے ساتھ ہوئی ان کے پانچ بیٹے (منن، ننھن، بڈھن، ابن اور رنجن) ہیں اور ایک بیٹی (بیگم) ہے دوسری بہن کنیز حسین کی شادی سید مصطفیٰ صفدر شاہ کشمیری کے ساتھ ہوئی جن کے ایک بیٹا ہے جن کا نام سید اعجاز حسین عرف بالو ہے۔ یہ قالین کی تجارت کرتے ہیں اور ایک بیٹی فاطمہ بیگم تھیں جو کشمیری محلہ منصور نگر لکھنؤ کے حاجی قاری سید اظہار حسین کو منسوب تھیں۔

ازواج عزیز[۲] عزیز نے تین نکاح کئے۔ پہلا نکاح ایک کشمیری خاتون کے ساتھ ہوا۔ جن سے مرزا ابو محمد کو یادگار چھوڑا تھا جو اتر پردیش سرکار کے مختلف کالجوں میں آرٹ ماسٹر رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے

---

[۱] یہ واقعہ مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد کے بھتیجے مولانا ساجد حسین کی زبانی معلوم ہوا۔
[۲] زبانی بیوہ عزیز

بعد اپنی پنشن کے اجراء کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے کہ اناؤ بس اسٹیشن پر قلبی دورہ پڑا اور انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ ۲۹ محرم ۱۳۹۶ھ (یکم فروری ۱۹۷۶ء) کو پیش آیا۔ جب کشمیری زوجہ نے داغِ مفارقت دیا تو کچھ عرصہ کے بعد عزیزؔ نے محمد صاحب بہارؔ لکھنوی کی چچا زاد بہن سے شادی کر لی اور ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام محمد مہدی رکھا جن کا نام رقعہ مجلس چہلم عزیزؔ مرحوم میں موجود ہے کچھ عرصہ کے بعد ان کی ماں یعنی عزیزؔ کی دوسری زوجہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ عزیزؔ کی تیسری شادی جناب سید مہدی ابن[۱] مولانا سید ابوالحسن (لکھنؤ) کی دختر کے ساتھ ہوئی۔ ان کا نام دلیہ بیگم ہے۔ سید مہدی علمِ نجوم کے جاننے والے تھے اور محلہ مقبرہ گولہ گنج لکھنؤ میں رہتے تھے۔ سید مہدی کے دو بیٹیاں ہیں ایک کی شادی عزیزؔ کے ساتھ ہوئی اور دوسری کی شادی مولانا سید علی صاحب ساکن محلہ مفتی گنج لکھنؤ کے ساتھ ہوئی جن کی یادگار مولانا علی ظہیر صاحب ہیں (افسوس کہ اس کتاب کی طباعت سے پہلے مولانا علی ظہیر صاحب اور بیوہ عزیزؔ نے یکے بعد دیگرے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون)

عزیزؔ کی اولاد[۲] مذکورہ دو ازدواج سے جو اولادیں ہوئیں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے موجودہ تیسری بیوی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار ہیں بڑے بیٹے مرزا محمد صادق تہذیبؔ لکھنوی ہیں۔ یہ دہلی کارپوریشن میں ملازمت کرتے ہیں اور وہیں بیوی بچوں کے ساتھ مستقل قیام ہے۔

---

[۱] سید مہدی کے چھوٹے بھائی مولانا سید علی حائری پنجاب میں مجتہد تھے۔

[۲] زبانی بیوہ عزیزؔ اور دختر عزیزؔ اختر سلطانہ

شاعر بھی ہیں۔ چھوٹے بیٹے مرزا محمد جعفر حیات لکھنوی ہیں یہ تہذیب صاحب سے تین سال چھوٹے ہیں۔ والد کی وفات کے وقت صرف چار سال کے تھے۔ پہلے ٹائمس آف انڈیا دہلی (اخبار روزانہ) میں ملازم تھے اب نیشنل ہیرالڈ پریس دہلی میں کام کر رہے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور مشاعروں میں اکثر اپنا کلام سناتے ہیں۔ عزیز لکھنوی کا غیر مطبوعہ کلام "انجم کدہ" کے نام سے شائع کیا ہے آپ کو اپنے والد کے بقا کے نام کی بڑی فکر رہتی ہے۔ بہت سا غیر مطبوعہ کلام اکٹھا کر رکھا ہے شاگردوں کے کلام پر عزیز کی اصلاحیں ایک ذخیرے کی صورت میں آپ کے پاس موجود ہیں۔ بڑی بیٹی افسر بیگم ہیں۔ یہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں اور عزیز کی وفات کے وقت تقریباً بارہ سال کی تھیں۔ آپ کی شادی التفات حسین کے ساتھ ہوئی جو اس وقت کراچی میں ہیں۔ دوسری بیٹی اختر سلطانہ جو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہیں باپ کی وفات کے وقت یہ آغوشِ مادر میں تھیں۔ آپ کے شوہر کا نام محمد آغا ہے یہ لکھنؤ کے محلہ پرانا حیدر گنج میں رہتے ہیں، حج و زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ اختر سلطانہ بھی کربلائے معلیٰ میں کئی سال تک رہنے کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہے طبیعت میں موزونیت ہے شعر خوب نظم کرتی ہیں۔

عزیز کا سراپا بالا قد، اکہرے، توانا تندرست تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ سڈول ناک، بڑی بڑی مونچھیں

سلہ زبانی بیوہ عزیز اور چند احباب و شاگردانِ عزیز

داڑھی منڈوانے تھے، بارعب اور متین تھے، چہرے پر کافی ملاحت تھی صورت سے شائستہ مزاجی، خودداری، تدبر و تفکر، علم و فضل اور تہذیبِ قدیم کے آثار نمایاں تھے۔

پوشاک اور خوراک[1] | چھالیٹین (لٹھا یا لانگ کلاتھ) کا بڑے پائچہ والا پائجامہ، ململ یا ادھی کا کرتا، کافی لمبی اور ڈھیلی (گرمیوں میں) ارگنڈی یا (جاڑوں میں) ہیمرو کی شیروانی، ایرانی سیاہ گول ٹوپی وارنش کی جوتی، یا پمپ جوتا پہنتے تھے۔ چغہ یا انگرکھا بھی اکثر پہن لیا کرتے تھے۔ صاف و براق کپڑے پہننے کے شوقین تھے۔ گھر کے اندر عام طور سے تہبند اور بنیا ئن ہی پہنے رہتے تھے۔

عزیزؔ خوش پوشاک ہی نہیں تھے خوش خوراک بھی تھے علی الصباح بعدِ نماز گھی میں تیار کئے ہوئے روے یا میدے کے حلوے کی دو قاشیں دو روغنی ٹکیاں ایک انڈا اور تقریباً ایک چھٹانک بالائی کھاتے تھے دوپہر کا کھانا صبح ساڑھے ۹ بجے ہی کھا لیا کرتے تھے دن اور رات کے دسترخوان پر ایک پیالہ قورمہ، ایک طشتری میں دہی، ایک طشتری میں بالائی تین یا چار چپاتیاں اور تھوڑے سے چاول ہوا کرتے تھے۔ پلاؤ اور مچھلی کے بہت شوقین تھے، دال سے کوئی رغبت نہیں تھی مسور کی دال کو عاشور کی دال اور مونگ کی دال کو بخار کی دال کہتے تھے۔ سہ پہر کو ایک پیالی یخنی پی کر ایک پیالی دودھ پی لیا کرتے تھے۔ چائے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ترکاری میں سیم کے بیج، مٹر کی پھلیاں اور پھول گوبھی کے دلدادہ تھے، جاڑوں

---

[1] زبانی بیوۂ عزیزؔ اور چند احباب و شاگردانِ عزیزؔ،

میں شہد اور بادام ضرور استعمال کرتے تھے۔ پھلوں میں آم بہت زیادہ پسند تھے۔ جوش ملیح آبادی آم کی فصل میں عزیز کے لئے آم ضرور لاتے تھے۔ کنویں کا پانی بہت پسند تھا اپنے ایک شاگرد باقر صاحب رنگین کے یہاں جاکر کنویں کے پانی سے نہایا کرتے تھے[1]۔ حقہ بہت پیتے تھے۔

عزیز کی تعلیم اور تربیت[2] عزیز نو سال تک اپنے والد علام کی تربیت میں رہے اور والد کے انتقال کے بعد جید عالم اور حکیم حاذق بڑے بھائی اور عزیز کی والدہ سکینہ بیگم[3] نے عزیز کی سرپرستی کی۔ پانچویں سال بسم اللہ ہوئی، مولانا حافظ شیخ اخلاق حسین پانی پتی نے قرآن مجید پڑھایا۔ ختم قرآن کے بعد تحصیل علوم کا سلسلہ شروع ہوا جس کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ عربی۔ ابتدائی کتب درسیہ مولوی محمد حسین صاحب سے پڑھیں پھر ۱۳۰۸ھ میں مدرسۂ مشارع الشرائع (ناظمیہ کالج) لکھنؤ میں داخلہ ہوا۔ عزیز لکھتے ہیں:۔

"میری عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی جب برادر مرحوم نے مجھ کو نجم العلماء[4] کے سپرد کیا۔ اس وقت مدرسۂ مشارع الشرائع کا آغاز تھا[5]۔

---

[1] زبانی باقر صاحب رنگین

[2] دیباچۂ دیوانِ گلکدہ از رحم علی الہاشمی ص۳

[3] کہا جاتا ہے کہ یہ محترمہ بہت ذہین تھیں اور عربی، فارسی اور اردو کے ادبیات میں دستگاہ رکھتی تھیں۔

[4] مولانا سید نجم الحسن صاحب مجتہد

[5] تجلیات ص۱۴

۱۳۱۲ھ میں درجہ چہارم (موجودہ سند میں مولوی کے برابر) پاس کیا۔ اس امتحان کے بعد مدرسہ کے ریکارڈ میں کسی اور امتحان کا پتہ نہیں چلتا لیکن متعدد اساتذہ کے تلامذہ کی فہرست میں عزیز کا نام ملتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عزیز نے اسکول کی پڑھائی تو ترک کردی مگر کسب علم کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور اپنے وقت کے جید علمائ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔

۲۔ صرف و نحو کی تعلیم مولوی لطف حسین سے حاصل کی۔

۳۔ فقہ اور اصول کے درس مولوی سید ابوالحسن سے حاصل کیے۔

۴۔ ادبیات کا علم شیخ فدا حسین اور پیارے مرزا سے بہم پہونچایا۔

۵۔ معقولات کے لئے مولوی عبدالحمید فرنگی محلی اور مولوی محمد نعیم فرنگی محلی کو اپنا استاد بنایا۔

۶۔ فارسی میں دُرہ نادرہ مولانا سید اولاد حسین بلگرامی سے اور چند کتابیں آغا سید محمد صاحب حاذق سے پڑھیں اور فارسی کی نظموں پر اصلاحیں بھی لیں۔

۷۔ تصوف کے درس مولوی عین القضاۃ بانی مدرسہ فرقانیہ فرنگی محل[۲] سے حاصل کئے۔ تحصیل علوم کا شوق موروثی تھا۔ بزرگوں سے ایک علمی ماحول چلا آرہا تھا۔ رحم علی لکھتے ہیں:۔

---

[۱] رجسٹر داخلہ مدرسہ مشارع الشرائع جمادی الاول ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء اس مدرسہ کا پہلا رجسٹر داخلہ بھی یہی ہے

[۲] مختصر سوانح حیات حضرت مولانا سید محمد عین القضاۃ از مولوی حافظ محمد افتخار علی ص۱۱ پر فہرست تلامذہ میں عزیز کا نام درج ہے۔

"عزیز کا خاندان کئی پشتوں سے علمی مذاق میں ڈوبا ہوا ہے۔
آپ کے والد مرزا محمد علی صاحب ایک زبردست فاضل تھے۔۔۔
انھوں نے اپنے تصنیفات سے ملک کو مستفیض کیا"[1]

اعجاز حسین تحریر فرماتے ہیں:۔

علم و فضیلت اس خاندان میں موروثی تھی۔ کئی پشتوں سے علمی خدمت انجام دی جا رہی تھی۔ عزیز نے اپنے خاندان کی روایت قائم رکھتے ہوئے تحصیل علم میں بلیغ کوشش کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اپنے عہد کے ممتاز صاحب علم سمجھے جاتے تھے[2]

عزیز کے اساتذہ اور اُن کا علمی مرتبہ | عزیز کا علمی معیار اُن کے اساتذہ کے علمی مرتبہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو زیادہ نمایاں ہوگا لہذا عزیز کے اساتذہ کا علم و فضل مختصراً ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ا۔ مولانا شیخ اخلاق حسین[3]

یہ بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کے علم کی بلندی کی وجہ سے مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد بڑی عزت کرتے تھے۔ راجہ احمد علی صاحب والی کسلیم پور اسٹیٹ (لکھنؤ) اُن کو برابر اپنے دولت کدہ پر مدعو کیا کرتے تھے اور علمی گفتگو رہتی تھی۔ اوقات فرصت میں راجہ صاحب مذکور کے مشہور کتب خانہ سے فیض حاصل کرتے تھے۔ جب یہ مولانا ناصر

---

[1] دیباچہ گلکدہ
[2] مختصر تاریخ ادب اردو
[3] زبانی قاری اظہار حسین صاحب محلہ منصور نگر لکھنؤ

حسین صاحب کے یہاں مہمان ہوتے تھے تو مولانا شبیر حسن، مولوی سید ذاکر حسین اور دوسرے مشہور علمائے لکھنؤ وہیں جمع ہوتے تھے اور علمی مسائل پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔[1]

۲۔ مولوی محمد حسین عرف پیارے مرزا

ایک ذی استعداد شخصیت تھی، مولوی محمد ہارون، مولوی سید سبط حسن جیسے مشہور علماء کے ہم جماعت تھے اور ساتھ ہی ممتاز الافاضل کی سند حاصل کی[2]۔ فارغ التحصیل ہو کر ایران چلے گئے اور مشہد مقدس میں مجاور ہو گئے۔ اہل ایران میں شمس المعارف[3] کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔

۳۔ مولوی سید ابو الحسن ابن سید نقی شاہ رضوی الکشمیری[4]

یہ پیدا ہوتے ہی والد کی منت کے مطابق کربلائے معلیٰ لے جائے گئے۔ وہیں تحصیل علم کا سلسلہ شروع ہوا۔ حجۃ الاسلام مرزا علی نقی طباطبائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ لکھنؤ واپس آئے تو کتب معقولات، فقہ و اصول فقہ پڑھے اور لکھنؤ کے نامور اساتذہ مثلاً مولوی محمد نعیم فرنگی محلی، مولانا سید حسین، مفتی محمد عباس اور مولانا سید علی محمد

---

[1] زبانی قاری اظہار حسین صاحب محلہ منصور نگر لکھنؤ

[2] نتیجہ امتحان فقہ و اصول درجہ اول (ممتاز الافاضل) از نجف اشرف عراق (یہ نتیجہ مدرسۂ ناظمیہ میں موجود ہے)

[3] رپورٹ سالانہ مدرسۂ ناظمیہ ۱۳۱۱ھ

[4] ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ محرم ۱۳۴۳ھ مطابق اگست ۱۹۲۴ء ص ۲۴

کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ عزیز خود لکھتے ہیں:۔

" آپ کے تلامذہ بکثرت ہیں۔ میں نے بھی جناب ممدوح سے عرصہ تک پڑھا ہے۔ آپ کی تصنیفات سے مختصر و مطول بتیس کتابیں ہیں۔ آپ نے اپنے اکثر مصنفات علمائے عراق کی خدمت میں بھجوائے۔ ان میں سے بعض نے آپ کو اجازات بھی دئے [۱]

۴۔ مولوی عبد الحمید فرنگی محلی [۲]

بارہ سال کی عمر تھی جب ۱۲۹۴ھ میں حفظِ قرآن سے فراغت پائی اور دیگر علوم کی تحصیل شروع کی۔ فقہ۔ تفسیر، صرف و نحو، منطق، حکمت اور تصوف وغیرہ میں فارغ التحصیل ہو کر ۱۳۰۶ھ سے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے بڑے بھائی مولانا عبد المجید کے علاوہ مولانا محمد اکرم مولانا عین القضاۃ، مولانا عبد الحیٔ اور مولانا محمد نعیم سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، مولانا عبد الحق مہاجر، مولانا عبد الغنی مجددی نے آپ کو نقشبندیہ سلسلوں کی اجازت دی اور شیخ مصطفےٰ مدنی نے حرمِ محترم میں خرقہ پہنا کر اپنی خلافت بھی دی۔ بے شمار تلامذہ آپ کے درس سے فیضیاب ہوئے۔ آپ نے ایک مدرسہ بھی مدرسہ قدیمہ کے نام سے جاری کیا۔ فقہ۔ تفسیر۔ صرف و نحو۔ منطق۔ کلام۔ حکمت، تاریخ، سیرت، تصوف اور اخلاق وغیرہ پر آپ کے تصانیف موجود ہیں جن کی تعداد بہتّر تک پہونچتی ہے۔

---

[۱] ماہنامہ "الواعظ" لکھنؤ محرم ۱۳۴۳ھ مطابق اگست ۱۹۲۴ء ص ۲۴

[۲] حالات علمائے فرنگی محل (یہ مخطوطہ مولانا عتیق میاں فرنگی محلی کے یہاں موجود ہے)

۵۔ مولوی محمد نعیم فرنگی محلی[۱]:۔

جید اساتذہ سے فیض تلمذ حاصل کیا۔ جیسے مولوی عبد الوحید، مولانا ابو البقا، محمد عبد الحکیم، شیخ محمد حنبلی مکی، شیخ محمد عرب شافعی، شیخ محمد یوسف حنفی، شیخ ابو خضر شافعی مدنی، سید محمد رضوان مدنی شافعی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہ سے علوم اور اجازات حاصل کئے۔

آپ کے تلامذہ کی فہرست بہت بڑی ہے چند کے اسماء درج کئے جاتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ آپ کیسے کیسے بلند مرتبہ علماء کے استاد تھے۔

مولوی عبد الرحمان، مولوی ابو تراب، مولوی لمعان الحق، مولانا عبد الخالق، مولوی عبد الغنی، مولانا عبد الحمید، مولانا محمد اکرم، مولوی رعایت اللہ، مولوی حسام الحق، مولوی عبد الباقی، مولوی مسیح اللہ، مولوی صمصام الحق، مولوی عبد الوہاب، اور حکیم عبد العزیز لکھنوی وغیرہ آپ کے شاگردوں میں سنی یا شیعہ کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ شیعہ تلامذہ میں آغا علی خاں لکھنوی، ہادی حسن نصیر آبادی، فدا حسین جونپوری میر فضل علی خاں لکھنوی، حکیم میر مہدی علی لکھنوی، مولوی سید محمد ہارون نصیر آبادی، محمد عسکری بنارسی، حکیم فدا حسین بریلوی لکھنوی، قاسم علی لکھنوی، کاظم حسین کنتوری، خواجہ امیر حسن پانی پتی، حکیم حسن مرزا لکھنوی اور مرزا ہادی[۲] لکھنوی وغیرہ تھے۔ ہندو طلبہ کے بھی نام ملتے ہیں۔ جیسے گنج بہاری لال لکھنوی، راجہ مہابلی لکھنوی وغیرہ اسی طرح اس رجسٹر میں تقریباً ڈھائی سو نام درج ہیں۔

---

[۱] فہرس المذکورین فی الکتاب ضمیمہ صفحہ ۱۱ (یہ مخطوط مولانا عتیق میاں فرنگی محلی کے یہاں ہے)

[۲] مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

۶۔ مولوی صوفی سید عین القضاۃ[1] بانی مدرسہ فرقانیہ۔

آپ مولانا عبد الحئی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور معقولات دینیات، فقہ، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی ذکاوت اور دستگاہِ علمی علماء میں ضرب المثل تھی۔ آپ کی تصنیفات میں عربی اور اردو کی سولہ کتابیں ہیں جن میں مطبوعہ بھی ہیں اور قلمی بھی آپ کی وفات بھی ایک علمی اور روحانی واقعہ سے متعلق ہے جو آپ کی سوانح حیات میں درج ہے۔

۷۔ مولانا نجم الحسن صاحب مجتہد[2]

آپ نے مفتی سید محمد عباس صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اُس کے بعد تدریس اور ترویج علوم میں انہماک رہا۔ ناظمیہ کالج کو ترقی دے کر ممتاز الافاضل کے درجات تک پہونچا دیا۔ درجۂ خاص کی تعلیم جس میں فقہ و اصول کی اعلیٰ کتابیں اور تفسیر، ادب، کلام فلسفہ اور ہیئت داخلِ درس تھے اپنے متعلق رکھی۔ مفتی محمد عباس کے تصانیف میں معاون رہے۔ انھیں سے نجم العلماء کا خطاب پایا۔ والیٔ رام پور نے آپ کی علمی اور انتظامی شہرت کا حال سُن کر اپنی ریاست کے مدارس علوم مشرقیہ کا نظم و نسق آپ کے سپرد کیا۔ ۱۳۱۴ھ میں راجہ صاحب محمود آباد (سیتاپور) کو توجہ دلا کر مدرستہ الواعظین کھلوایا تین سال تک آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی صدارت کی۔ آپ کے صدارتی خطبے سُن کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے اور بعض اہلِ علم تو انھیں حکیم العلماء

---

[1] مختصر سوانح حیات حضرت مولانا سید محمد عین القضاۃ، بانیٔ مدرسہ عالیہ فرقانیہ صٓ سے صہ۵۵ تک

[2] تجلیات از عزیز لکھنوی (سلسلۂ دوم صہ۳۰۵)

کہنے لگے۔ علمائے ایران وعراق نے آپ کے بعض رسائل پر جو زبردست تقریظیں لکھی ہیں وہ آپ کے تبحرِ علمی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لکھنؤ کی مجلس علما کے صدر نشین بھی ہوئے۔ حکام دولت میں بھی آپ کی جلالت وقدر مسلم تھی۔ چنانچہ آپ کسی مقدمہ وغیرہ کے سلسلہ میں عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ تھے اور "شمس العلماء" کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ درس وتدریس اور مدرسوں کے انتظامات میں ہمہ وقت مشغول رہنے کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا تاہم چند کتابیں مباحث مختلفہ میں تحریر فرمائی ہیں۔

۸۔ جناب شیخ فدا حسین بسوانی[1]

آپ تیرہ سال کی عمر میں تمام کتب درسیہ ونظامیہ سے فارغ ہو گئے اور وادیٔ تالیف وتصنیف میں قدم رکھا۔ آپ کے تصانیف عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں ہیں جو فلسفہ، حکمت، تاریخ، کلام اور رجال سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی آپ کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ ایک عرصہ تک آپ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے ممبر بھی رہے جس سے آپ کی علمی، سماجی وقعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۹۔ مولوی لطف حسین[2]

آپ کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ استاذ الاساتذہ مولانا ناصر حسین مجتہد (صاحب عبقات) نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کے فضل وکمال کے اظہار کے لئے یہی کہہ دینا کافی ہے کہ آپ صاحب عبقات کے استاد تھے۔

---

[1] تکملۂ نجوم السماء ص ۲۵۵ اور "تجلیات" سلسلۂ دوم ص ۳۰۲

[2] زبانی مولانا سید علی مجتہد محلہ کٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ بتاریخ ۷ مارچ ۱۹۰۲ء

عزیز کی سیرت

خوش طبعی اور شگفتہ مزاجی آپ کی خوش طبعی کا یہ حال تھا کہ جو ایک بار شرفِ نیاز حاصل کر لیتا ہمیشہ کے لئے مرید ہو جاتا تھا بہت ہی سنجیدہ اور شائستہ ظرافت کے مالک تھے[۱]۔ آپ کا قول تھا کہ جو ظریف نہیں شاعر نہیں بن سکتا[۲]۔

شر آمیز گفتگو سے نفرت ایسی گفتگو نہ کبھی خود کرتے تھے اور نہ سنتے تھے۔ اگر کسی کی گفتگو میں کوئی ملاوٹ یا آمیزش پاتے تو فوراً برہم ہو جاتے تھے۔ شاید اسی لئے ان کو مغلوب الغضب بھی کہا جاتا تھا۔ اسی سلسلہ میں ایک واقعہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے راقم سے بیان کیا تھا۔ آرزو لکھنوی نے آپ (مسعود صاحب) سے ایک شعری نشست قائم

---

۱ زبانی بیوہ عزیز لکھنوی۔

۲ زبانی باقر صاحب رنگینی۔

کرنے کے لئے کہا جو کسی نہ کسی اہل زبان کے گھر پر باری باری ہوا کرے۔ آپ نے عزیز سے مشورہ کیا۔ عزیز کو یہ تجویز پسند آئی۔ پھر اس شبستان شعر و ادب کی تلاش شروع ہوئی جہاں سے اس نشست کا آغاز ہو۔ عزیز ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ "آپ متفق ہوں تو صفی صاحب کے یہاں سے اس نیک کام کو شروع کیا جائے" آپ نے (عزیز نے) برجستہ فرمایا کہ "کیا آپ ان کو اہل زبان سمجھتے ہیں" دوسرا نام آرزو لکھنوی کا پیش کیا تو عزیز نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر چشم و ابرو کی جنبش کہہ رہی تھی کہ تم نے بھی کس کا نام لے لیا۔ مسعود صاحب کے بار بار اصرار پر عزیز نے وحشت کلکتوی اور شاد عظیم آبادی کے نام لئے۔ لکھنؤ کی شعری نشست کے لئے کلکتہ یا پٹنہ پہونچنا آسان نہ تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نشست قائم نہ ہو سکی۔ اگر مسعود صاحب نے صفی اور آرزو کے بعد عزیز کا نام بھی لے لیا ہوتا تو شاید یہ نشست شروع ہو جاتی۔

خودداری یہ جوہر عزیز میں بدرجۂ اتم موجود تھا جس نے آپ کے لبوں کو آشنائے سوال نہ ہونے دیا۔ آپ کے عقیدت مندوں، دوستوں اور شاگردوں کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی[1]۔ عزیز کی خودداری پر ایک واقعہ عزیز کے شاگرد باقر صاحب رنگین نے بیان کیا کہ جوش ملیح آبادی حیدرآباد میں تھے اور عزیز اپنی قلیل آمدنی پر لکھنؤ میں قناعت کی زندگی گذار رہے تھے جوش نے نظام حیدرآباد سے عزیز کے علم و فن کو بیان کیا جس پر نظام نے اپنا درباری شاعر بنانے کے لئے عزیز کو طلب کیا۔ جوش بہت خوش ہوئے اور فوراً عزیز کو خط لکھ کر

---

[1] زبانی بیوۂ عزیز اور باقر صاحب رنگین۔

بُلایا۔ مگر عزیزؔ کی خودداری نے اجازت نہیں دی۔ جوشؔ کو جواب لکھا کہ "تم کو میرا آنا دکھلائی پڑ رہا ہے اور مجھے وہاں سے رخصت ہونا۔ والیانِ ریاست کی تین نگاہیں ہوتی ہیں۔ پہلی نظر میں اشتیاقِ ملاقات، دوسری نظر میں تعظیم و تکریم اور انعامات اور تیسری نظر میں نفرت اور غیظ و غضب"[۱]۔ اکثر وبیشتر عزیزؔ کہا کرتے تھے کہ "مجھ جیسے انسان سے والیانِ ریاست کا رکھ رکھاؤ ممکن نہ ہو گا"[۱] باایں ہمہ عزیزؔ کی زندگی کا آخری دور وابستۂ والیٔ ریاست رہا۔

صبر و تحمل اور شرافتِ نفس | آپ کے علم و فضل اور نام و نمود سے کچھ معاصرین بہت حسد کرتے تھے اور آپ کے کلام پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ مگر عزیزؔ نے ان کو کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اگرچہ اُن کے تلامذہ اور احباب جب تاب ضبط نہ لا سکے تو مورچہ لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ یگانہ چنگیزی[۳] کو ناطقؔ لکھنوی نے اور مانی جائسی کو اثرؔ لکھنوی نے جوابات دیے۔ یگانہ کے کچھ اعتراضوں کے جوابات عزیزؔ کی طرف سے اکبر الہ آبادی نے بھی دیئے ہیں[۵]۔

مولانا محمد حسن خاں عرشیؔ لکھنوی راوی ہیں کہ کیننگ کالج میں مشاعرہ

---

[۱] زبانی رنگینؔ لکھنوی (یہ اپنی چار پانچ سال کی عمر سے عزیزؔ کی حاضری میں رہے اور عزیزؔ کے آخری دم تک ان کی خدمت کی)

[۲] زبانی محمد حسن خاں عرشیؔ لکھنوی (یہ اسلامیہ انٹر کالج لکھنؤ اور ندوۃ العلماء میں معلم رہے اور عزیزؔ کے دوست تھے)

[۳] شہرتِ کاذبہ موسوم بہ خرافاتِ عزیزؔ از یگانہ چنگیزی

[۴] رسالہ تسنیم سنہ ۱۹۳۳ء کی فائل۔

[۵] مکاتیبِ اکبر ص ۸۱

تھا۔ میں عزیز صاحب کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ یگانہ اپنی غزل سنانے گئے اور عزیز صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ عزیز صاحب یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔ اس شعر کی داد میں آپ سے چاہوں گا۔ عزیز نے برجستہ کہا، ارشاد، یگانہ نے شعر پڑھا ؎

محرومیوں میں گذری ناکامیوں میں گذری
عمر عزیز گذری اور خامیوں میں گذری

شعر سن کر عزیز کے چہرے کا رنگ تو ضرور بدل گیا مگر قوتِ ضبط یہ تھی کہ زبان سے ایک حرف بھی نہیں نکالا اور شرافتِ نفس اس پائے کی تھی کہ مجھ سے کبھی یگانہ کی برائی نہیں کی[1]

فراخ دلی اور مہمان نوازی آپ کے یہاں مجبوں اور شاگردوں کا مجمع رہا کرتا تھا۔ حقہ اور پان برابر چلتا رہتا تھا۔ جوش بھی جب لکھنؤ آتے تھے تو زیادہ تر عزیز ہی کے یہاں آرام کرتے تھے۔ رحم علی الہاشمی لکھتے ہیں :-

"احباب کو آپ سے مل کر ایک لطفِ بے تکلفی اور انبساط حاصل ہوتا ہے اور یہ مصرع یاد آتا ہے ؏

نشاطِ عمر ملاقات دوستداران است[2]

سچی دوستی عزیز اپنے دوستوں کا ہمدرد دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، تصنع اور بناوٹ سے نفرت تھی۔ جس سے دوستی کرتے تھے پورا پورا حق دوستی ادا کر دیتے تھے۔

---

[1] زبانی محمد حسن خاں عرشی لکھنوی۔

[2] دیباچۂ گلکدہ ص۲

اکبر الہ آبادی سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اکبر آپ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ نے اپنا مکان خالی کر دینے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ خدا ایسے دوست کو زندہ رکھے[1]"

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"زبانی اظہار محبت تو سہل ہے آپ نے عملی ثبوت دیا اللہ جزائے خیر دے[2]"

عزیز اور کلام عزیز کی جو سچی تصویریں اکبر الہ آبادی نے اپنے خطوط میں کھینچی ہیں اُن میں سے کچھ "مکاتیب اکبر[3]" میں محفوظ ہیں جن کی چند جھلکیاں حسب ذیل ہیں:۔

"یہ کلام[4] اس لائق نہیں ہے کہ شعراء کے سامنے پیش کیا جائے۔ بالخصوص شعرائے دہلی و لکھنؤ اور پھر آپ جیسے شاعر لطیف الطبع و رنگیں خیال ....." خط نمبر ۱۔

---

[1] مکاتیب اکبر خط نمبر ۲۳ مورخہ ۲ر نومبر سنہ ۱۹۲۰ء

[2] مکاتیب اکبر خط نمبر ۲۴ مورخہ ۹ر مئی سنہ ۱۹۲۱ء

[3] اکبر الہ آبادی نے عزیز لکھنوی کو جو خطوط بھیجے تھے ان میں جو دستیاب ہوئے، ان کا یہ ایک مطبوعہ ذخیرہ ہے۔

اس مجموعہ میں پہلا خط ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء اور آخری خط ۸ ۲ر اگست سنہ ۱۹۲۱ء کا ہے اس طرح آغاز اور انجام کی مدت ۱۳ سال ہے۔ کل ۲۵ ۳ خطوط ہیں۔

[4] کلام اکبر

" آپ کی قابلیت اور آپ کی محبت اور نیک دلی میرے لئے دلکش ہیں" خط نمبر ۱۳

" جو کچھ ہو آپ کی مدح سے خوشی ضرور ہوتی ہے" خط نمبر ۳۰

" آپ نے میرے مطلع کی عزت افزائی کی مسلمان ہو گیا" خط نمبر ۳۱

" دو تین شعر عرض کرتا ہوں بنظر اصلاح ملاحظہ ہوں" خط نمبر ۴۲

" سچ یہ ہے کہ لکھنؤ اب آپ ہی کے دم سے ہے۔ یہ شرافت یہ علم یہ مذاق یہ محبت یہ ہمدردی یہ دانش مندی یہ سلامت روی۔ ان سب کا اجتماع مشکل ہوتا ہے" خط نمبر ۵۷

" علم اور تجربہ اور نظر غائر نے آپ میں ایک خاص بات پیدا کر دی ہے اور آپ کے خیالات ...... عمومی سطح سے بلند تر ہو گئے ہیں۔ اس سبب سے میں آپ کی بہت قدر کرتا ہوں" خط نمبر ۶۰

" ماجد صاحب کی بھی بصیرت کی میں داد دیتا ہوں کہ وہاں آپ سے بہتر کسی کو نہیں سمجھتے" خط نمبر ۷۶

" رسالۂ خیال میرٹھ ملاحظہ فرمایئے شروع ہی میں آپ کا ذکر ہے" خط نمبر ۱۴۲

" مجھ کو نہایت مسرت ہوئی کہ آپ ایسے ذی علم شائستہ خیال نقادِ سخن تصدیق فرماتے ہیں کہ میں نے وقت ضائع نہیں کیا" خط نمبر ۱۴۳

" مجھ کو نہایت مسرت ہوئی کہ آپ نے اس شعر کی داد دی یہ شعر کیا اور اس کا مصنف کیا لیکن آپ کی عالی نظری اور وسعتِ مذاق ثابت ہے کیوں نہ ہو آپ شاعر بھی ہیں اور فاضل بھی ہیں" خط نمبر ۱۴۴

کلامِ عزیز پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ شاعری کے باب میں درج ہے۔

کتب بینی | ذوقِ مطالعہ موروثی تھا کتب بینی کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے ہو سکتا ہے کہ اسی لیے آپ کو عزلت اور گوشہ نشینی سے اُنس رہا ہو۔ موقع پاتے ہی گوشہ نشینی اختیار کر لیتے تھے اور کتابوں کی ورق گردانی شروع ہو جاتی تھی۔ آپ کا شعر ہے ؎

گوشۂ عزلت ہے اور سیرِ دو عالم ہے عزیزؔ
کیا بتائیں لطف ملتا ہے کتب خانہ سے کیا

رحم علی الہاشمی لکھتے ہیں:۔

"آپ نے عرصۂ دراز تک کتب بینی کے لئے اپنے دل و دماغ کو وقف کر دیا اور اب بھی سوائے اس کے کوئی مشغلہ نہیں۔ آپ کے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون اور اکثر نوادرِ کتب کا ذخیرہ میں نے دیکھا ہے آپ فنونِ ادبیہ کے زبردست ماہر ہیں۔ آپ کا کمال مسلم ہے۔"[1]

جذبۂ ہمدردی | ہمدردی کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اِس لحاظ سے عزیزؔ ایک اعلیٰ شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ انسان بھی تھے آپ کی تصنیف "نالۂ جرس موسوم بہ تومیاتِ عزیزؔ" اٹھا کر دیکھئے کہ آپ نے کتنا دردبھرا دِل پایا تھا۔ مجبوروں اور یتیموں کو دیکھ کر وہ بیتاب ہو جاتے تھے اور اپنی کم مائیگی پہ افسوس کرتے تھے "نالۂ جرس" کا پہلا ہی قطعہ[2] آپ کے دردِ دل کی تصویر پیش کرتا ہے۔

---

[1] دیباچہ گلکدہ ص۲
[2] عزیزؔ کی شاعری کے باب میں درج ہے۔

انکساری اور خاکساری | آپ کے مزاج میں انکسار اور خاکساری کا جوہر بھی موجود تھا۔ جس وقت "الواعظ" ماہوار (لکھنؤ) کی ادارت آپ کے سپرد کی گئی تو آپ نے لکھا:۔

"کہاں الواعظ اور کہاں ایک خرابات نشیں۔ الواعظ کے فرائض کو جیسا چاہیئے ادا نہیں کر سکا۔ اس کا اصل راز میری بے مایگی کے علاوہ قلتِ فرصت ہے[1]"

آپ "قصائدِ عزیزؔ" میں اپنے قصیدوں کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"یہ چند قصیدے جو اس وقت شائع ہوئے ہیں۔ بحیثیتِ شاعری ہرگز اس قابل نہ تھے کہ شہرت کے عام منظر پر لائے جاتے کیونکہ جب مجھ کو خود پسند نہیں تو نقادانِ فن کیا پسند کریں گے مگر احباب کے اصرار سے مجبور ہو گیا[2]"

یہ رائے ان قصیدوں کے لئے قائم کی گئی جو عہدِ جدید کے قصائد میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور نقادانِ فن نے عزیزؔ کو سلطانِ قصیدہ کہا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث شاعری کے باب میں موجود ہے۔ عزیزؔ کی منکسر مزاجی پر مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں:۔

"عزیزؔ صاحب طبعاً متواضع اور منکسر مزاج تھے[3]"

قیافہ شناسی | آپ اپنی قیافہ شناسی کے زور پر بعض اوقات پیشین گوئی بھی کر دیا کرتے تھے جو اکثر صحیح ثابت ہوتی تھی۔ شاگردوں کی صحیح رہنمائی میں

---

[1] ماہوار رسالہ "الواعظ" لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۳۶ء ص ۲

[2] مقدمہ بر "قصائدِ عزیزؔ" ص ۳

[3] انشائے ماجد جلد دوم ص ۱۶۹

آپ کی قیافہ شناسی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ایک مرتبہ شوکت تھانوی کے ماموں شوکت کو عزیز کی خدمت میں لائے اور کہا کہ اس لڑکے کو اپنی شاگردی میں لے لیجئے۔ آپ نے شوکت سے کچھ غزلیں سنیں اور فوراً نتیجہ سنا دیا کہ یہ لڑکا اگر نثر نگاری کرے تو چمکے گا۔ آج شوکت تھانوی اپنی نثر نگاری کی وجہ سے زندہ ہیں۔[1]

دینداری آپ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے امام حسینؑ کی مجلس و ماتم سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا۔ عزاداری پر ہمیشہ اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔[2] آپ کے تصانیف "صحیفۂ ولا" اور "نالۂ جرس" آپ کے مذہبی عقائد کے آئینہ دار ہیں۔[3]

عزیز کے بیشتر ایام حیات علمائے دین اور مجتہدین کے ساتھ گذرتے تھے عزیز کے آباؤ اجداد بھی اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ تھے۔ عزیز بھی اپنے بزرگوں کی طرح دین و مذہب کی دل سے قدر کرتے تھے جس کا ثبوت عزیز کے ادبی کارناموں سے ملتا ہے۔

شعر کہنے اور پڑھنے کا انداز آپ جو کچھ کہتے تھے بوقت واحد کہتے تھے۔ اگر غزل کہنا ہے تو بس بیٹھ گئے۔ حقہ اور خاصدان سامنے بھرا رکھا رہتا تھا۔ حقہ پیتے رہتے تھے، پان کھاتے رہتے تھے اور غزل کے شعر

---

[1] زبانی رنگین لکھنوی

[2] زبانی بیوۂ عزیز

[3] "صحیفۂ ولا"، "نالہ جرس"، "سوانح حیات شہید ثالث"، "سوانح حیات شہید رابع" وغیرہ۔

کہتے جاتے تھے جب تک پوری غزل مکمل نہیں کر لیتے تھے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتے تھے۔ یہ عادت صرف غزل ہی تک محدود نہ تھی۔ کلام کی کوئی بھی صنعت ہو، چاہے نظم ہو یا قصیدہ بوقت واحد مکمل کرتے تھے[1] جھومتے رہتے تھے اور شعر کہتے اور لکھتے رہتے تھے۔ غزل یا قصیدہ وغیرہ کہنے کے بعد اس پر نظر ثانی ضرور کرتے تھے۔ اکثر خواب میں بھی شعر کہتے تھے۔ شعر گوئی کا کوئی وقت نہ تھا جب طبیعت موزوں ہوئی کہہ لیا۔

شعر پڑھنے کا انداز بھی بہت مؤثر تھا۔ خدا نے آواز میں قیامت کا ترنم دے دیا تھا۔ کلام کی عمدگی میں دلکش ترنم سونے پر سہاگے کا کام کرتا تھا۔ مشاعرہ ان کے دم سے کامیاب ہو جاتا تھا۔[2]

کسب معاش کچھ عرصہ تک ایک انگریز کو فارسی پڑھائی جس سے ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔[3] پھر مرزا آغا علی صاحب ناظم کے بیٹے مرزا محمد عباس علی خاں صاحب کے یہاں ملازمت کر لی۔ خانصاحب ڈپٹی کمشنر تھے اور شہر کے بڑے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور محلہ نخاس میں وکٹوریا اسٹریٹ پر ان کا محل تھا اور اب بھی ہے۔ عزیز کئی سال تک ان کے معتمدِ خاص رہے اور بہت ہی عزت و احترام اور بے فکری کی زندگی گذارتے رہے۔ عزیز لکھتے ہیں :۔

---

[1] زبانی بیوۂ عزیز اور سید اعجاز حسین عرف بابو ہمشیر زادۂ عزیز۔ مگر یہ بات قصیدوں کے لیے قرین قیاس نہیں ہے۔

[2] زبانی رنگین لکھنوی

[3] زبانی بیوۂ عزیز لکھنوی

"ان کی خاص عنایتیں میرے حال پر مبذول رہتی تھیں۔
ان کی قدر شناسی کا کلمہ گو ہوں اور اُن کے اخلاقِ حسنہ کا رازدار
...... جس کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی سے وہ امورِ خیر میں اپنا
روپیہ صرف کرتے تھے وہ سب میرے ہاتھ سے ہوتا تھا"[1]

مرزا عباس علی خاں کا انتقال ۳۱ر مئی ۱۹۱۰ء[2] کو ہوا، اس کے بعد عزیز نے اس آستانہ کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی اور امین آباد (لکھنؤ) ہائی اسکول میں اردو اور فارسی کے معلم مقرر ہوئے اور پھر کئی سال تک اس اسکول میں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں اسکول کی نوکری چھوڑ کر راجہ صاحب محمود آباد (سیتاپور) کے یہاں ان کے اصرار پر جانا پڑا۔ مہاراجہ صاحب نے اپنے صاحبزادوں (امیر احمد خاں صاحب اور امیر حیدر خاں صاحب کا اتالیق مقرر کیا۔ پھر موصوف نے عزیز کا علمی ذوق دیکھ کر اپنے کتب خانہ کی دیکھ بھال بھی سپرد کردی ۱۹۲۴ء تک وہیں رہے، ان مصروفیات کے علاوہ آپ کئی سال تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ میں ممتحن بھی رہے[3]

وفات عزیز کی زندگی آرام سے گذر رہی تھی کہ ذیابطیس کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ یہ حملہ تقریباً ۱۹۲۵ء میں ہوا[4] اور اسی وقت سے علالت

---

[1] رسالۂ معیار (لکھنؤ) بابت جنوری ۱۹۱۱ء ص ۱۱
[2] ایضاً
[3] دیباچۂ گلکدہ ص ۲
[4] سرفراز لکھنؤ ۳ر اگست ۱۹۲۵ء

کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین رضوی سول سرجن لکھنو اور ڈاکٹر عبدالحمید کے زیر علاج رہے[1] رفتہ رفتہ مرض نے خطرناک صورت اختیار کرلی۔ شدتِ مرض میں آپ محمود آباد سے لکھنو تشریف لائے[2] راجہ صاحب محمود آباد کی سرپرستی میں کون سا علاج ممکن نہ تھا۔ نامی گرامی ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج[2] رہا۔ ڈاکٹر منصور، ڈاکٹر اشتیاق، ڈاکٹر عبدالحمید، حکیم عبدالحمید اور حکیم صاحبِ عالم وغیرہ کے مشوروں پر عمل کیا گیا۔ میڈیکل کالج لکھنو میں داخل ہوئے۔ راجہ صاحب نے تقریباً گیارہ ہزار روپیہ[3] علاج پر صرف کئے۔ مگر عزیز کا وقت موعود آ گیا تھا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء (۷ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ) کو بروز دوشنبہ بوقت ۷ بجے شب آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اخبار "سرفراز لکھنو"، خبرِ وفات کے ساتھ اپنے تاثرات کو اس طرح واضح کرتا ہے:۔

"آہ عزیز لکھنوی"

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ابھی ہم راجہ نواب علی خاں صاحب مرحوم (تعلقدار اکبر پور ضلع سیتاپور) کے تازہ غم میں مبتلا ہی تھے کہ اسی روز قوم کے

---

[1] زبانی بیوہ عزیز لکھنوی
[2] ایضاً
[3] ایضاً

شہرۂ آفاق ادیب و شاعر جناب مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کا داغِ مفارقت بھی ہمیں اٹھانا پڑا۔ غم اور انتہائی غم اس امر کا ہے کہ ان دونوں ہی فردوں کے مرنے کے دن نہ تھے۔ وا دریغا کہ موت نے بہت جلدی کی اور .... حضرت عزیز کو گوشۂ تربت میں پہونچا کر علم و ادب کی مجلسیں برباد کر دیں.... آپ کی موت سے دنیائے اردو کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے اور اس سانحہ پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ وہ قوم و ملک و ملت، زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ اُن کی ذات سے قومی اداروں کو فائدے پہونچے۔ مرحوم عرصہ سے ایک ادبی تاریخ کی تالیف میں مصروف تھے جو افسوس وقت موت سے نامکمل رہ گئی۔ جناب عزیز کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ جناب عزیز کی وفات بھی ایک اہم ترین قومی و ملی نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے صاحبزادگان اور دیگر پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے[۱]۔"

اسی اخبار میں عزیز کی تجہیز و تکفین کی خبر بھی شائع ہوئی ہے اخبار لکھتا ہے:۔

دو شنبہ کو سہ پہر کے وقت جناب راجہ صاحب مرحوم کی تدفین انجام پائی تھی کہ شب سہ شنبہ میں لکھنؤ کے مشہور و ممتاز لٹریچر

---

[۱] اخبار سرفراز لکھنؤ ۳ اگست ۱۹۳۵ء

جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اتنی بڑی ہستیوں کے پے در پے انتقال نے اہلِ لکھنؤ کو بدحواس کر دیا۔ سہ شنبہ کی صبح کو حضرت عزیز مرحوم کا جنازہ آپ کے ذاتی مکان سے نہایت عزت و احترام کے ساتھ پاٹا نالہ کے غسل خانہ میں لایا گیا جہاں تجہیز و تکفین کی گئی۔ اس کے بعد میت بمقام کھجوا (مرزا محمد عباس علی خاں کے باغ میں) دفن ہوئی۔ جناب شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں کثیر التعداد مومنین شریک ہوئے حضرات مجتہدین بھی موجود تھے۔ ہر دل غم دیدہ ہر آنکھ غمناک تھی۔[1]

مجلسِ سوم ۲ اگست ۱۹۳۵ء کو حسینیہ ناظم صاحب میں منعقد ہوئی مجمع بہت زیادہ تھا۔ مولانا و ملا مرزا احمد طاہر صاحب نے فضائل و مصائبِ سید الشہدا، بیان فرمائے۔[2]

---

[1] اخبار سرفراز لکھنؤ ۳ اگست ۱۹۳۵ء

[2] اخبار سرفراز لکھنؤ، اگست ۱۹۳۵ء (۶ جمادی الاول ۱۳۵۶ھ)

نذرانۂ عقیدت

از جناب سید مونس حسین صاحب نقوی امروہوی:۔
"......عزیز لکھنوی کے انتقال سے دنیائے ادب کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اور میں بلاخوف تردید یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ موجودہ دبستانِ لکھنؤ کا رنگِ تغزل صفی، آرزو، ثاقب، چکبست ناصری، یونس، اور عزیز مرحوم کی ادبی کوششوں کا نتیجہ ہے[1]"

جناب سید حافظ حسین صاحب اسیر سندیلوی:۔
"دریں حدیقہ بہار وخزاں ہم آغوش است زمانہ جام بدست جنازہ بردوش است

کل ہی بزم مشاعرہ میں آپ جلوہ افروز نظر آتے تھے۔ آپ کی نغمہ سنجیوں سے فضائے ادب معمور تھی۔ لیکن آج گوشۂ قبر ہے اور آپ۔ آہ کسے خبر تھی اور کون جانتا تھا کہ اس قدر جلد حضرت عزیز مرحوم سا قابل اور مشہور شاعر پیوندِ خاک ہوجائے گا۔ آپ سا

---

[1] اخبار سرفراز لکھنؤ ۱۳؍اگست ۱۹۳۵ء (۱۲ جمادی الاول ۱۳۵۶ھ)

جلیل القدر ادیب زمانہ کے گھنے بادلوں میں روپوش ہوجائیگا
آپ کے انتقال پُر ملال سے جو قوم اور ادب کو نقصان پہونچا ہے
ناقابلِ تلافی ہے۔ خدا آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور
آپ کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین ؎

پردہ اک ہلکا سا حائل ہوگیا ہے موت کا ورنہ زندہ آج بھی ہے نکتہ سنج و نکتہ داں[1]

انجمن معین الادب[2] محمود آباد ضلع سیتاپور:۔

آج عزیز نہیں ہیں مگر وہ کارنامے جنھوں نے حقیقتاً دنیائے ادب میں اُن کو عزیز بنادیا زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ محمود آباد میں شعر و سخن کا چرچا کم تھا عزیز مرحوم نے بزم معین الادب قائم کی اور اُس کے معین ہوئے۔ اراکینِ مشاعرہ کو آپ کی صدارت پر ہمیشہ فخر رہا۔ مگر آپ کی موت نے جہاں دنیائے شعر و ادب میں تہلکہ مچادیا وہاں بزم معین الادب کو جو کہ خصوصیت کے ساتھ انھیں کے دامن سے وابستہ تھی پامال کردیا۔ اراکین بزمِ ادب نے اپنے بڑھے ہوئے جوش اور حسنِ عقیدت کا اظہار ۱۳ اگست ۱۹۲۵ء کو انعقادِ مجلسِ تعزیت سے کیا۔ خداوند کریم مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔[3]

قطعاتِ تاریخِ وفات

---

[1] اخبار سرفراز لکھنؤ ۱۴ اگست ۱۹۲۵ء (۲۴ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)
[2] اس انجمن کو عزیز ہی نے قائم کیا تھا۔
[3] اخبار سرفراز لکھنؤ ۲۱ اگست ۱۹۲۵ء (۲۰ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)

خان بہادر مولوی سید احمد علی خانصاحب ریٹائرڈ مجسٹریٹ پٹنہ [1]

یک ناظم ممتاز نماند آہ آہ — رفت از جہاں آں کامل بے مثل نیز
تاریخ بشنو احمد از و شاعرے — صد حیف بے جاں شاعر یکتا عزیز

۱۳۵۴ھ

نازک خیال ناظم شیریں مقال شاعر — ہر دلعزیز مومن عالی مقام ہادی
شد از جہاں چو راہی از بہر سال فصلی — گفتم ۔ ارم بر رفتہ پیش امام ہادی

۱۳۴۳ف

جناب یونس زیدپوری [2]

عزیز فرد و نامی از جہاں رفت — پئے مادر فراقش صبر مشکل
عدیم المثل و یکتائے زمانہ — مثال مقبل و مقبول و باذل
مخواں جادو بیاں معجز بیاں بود — لسان میر و مرزا بود کامل
پئے تاریخ از یونس بگفتند — احبائے عزیز صاحب دل
ہماندم بے سر اندیشہ ایں گفت — عزیزو مصر معنی خلد منزل

آہ
۱۳۵۵ ۔ ۱ = ۱۳۵۴ھ

جناب محشر لکھنوی [3]

اے عزیز محترم اے شاعر شیوا زباں — راہ لی ملک عدم کی سب کو کہہ کر خیرباد
لوگ کہتے ہیں کیا دنیا سے جنت کو سفر — ہم یہ کہتے ہیں کہ رکن شعر گوئی او فتاد

---

[1] سرفراز لکھنؤ ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء (۱۴ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)
[2] ایضاً ۱۷ اگست ۱۹۳۵ء (۱۶ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)
[3] ایضاً ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء (۲۶ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)

جذبِ مداحی سے جب آئے علیؑ ہنگامِ نزع — رنجِ بیماری مٹا دل ہو گیا اس طرح شاد
بے طلب حاصل ہوا اک قصیدہ کا صلہ — آ گئے وہ قبر میں جن کو کیا کرتے تھے یاد
قدرتاً پیدا عناصر میں تھی وہ پاکیزگی — دور تھے بغض و حسد سے آب و آتش خاک و باد
یوں زبانِ حال سے گویا ہیں نظمیں دلفریب — یوسفِ مصرِ معانی تھا عزیزؔ اوستاد
کینہ تھا دل میں کسی سے اور نہ تھا بغض و حسد — گو کہ مسکن تھا میانِ عالمِ کون و فساد
روزِ بست و ہفتم ماہِ ربیع الآخریں — مرنے والا اٹھ گیا دنیا کو کہہ کر خیرباد
خامۂ محشرؔ نے لکھا مصرعۂ سالِ وفات — اٹھ گیا بزمِ سخن سے شاعرِ والا نہاد

١٩٣٥ء

فریدوں مرزا مجروحؔ سکریٹری انجمنِ اصلاحِ ادب لکھنؤ[1]

اے عزیزِ نکتہ رس اے شاعرِ شیریں مقال — تیرے مرنے سے ہوا کمزور بابِ شاعری
لکھنؤ کا ذرہ ذرہ کیوں نہ ہو ظلمت کدہ — چھپ گیا زیرِ زمیں دُرِ خوش آبِ شاعری
تیرے کامل ہونے پر شاہد ہے خود تیرا کلام — اے عزیزِ مصرِ مضموں انتخابِ شاعری
تجھ کو فنِ شعر میں قدرت تھی ہر اک چیز پر — برگزیدہ فرد تھا نزدِ جنابِ شاعری
مدح خوانی تو نے کی آلِ نبیؐ کی عمر بھر — فیض پائے حق سے تو نے فیضیابِ شاعری
بلبلِ گلزارِ مدحت طوطیِ باغِ سخن — آج ان جلوں میں ہے تجھ سے خطابِ شاعری
ہم ہیں بالائے زمیں روپوش تو زیرِ زمیں — کس طرح برسے گا اب تیرا سحابِ شاعری
چل کے تند و تیز تو نے فتنۂ بادِ اجل — کر دیئے برباد اوراقِ کتابِ شاعری
پہونچے تیری روح کو میرا سلامِ آخری — اے عزیزِ من زلیخائے شبابِ شاعری
سالِ رحلت خونِ دل سے یوں لکھا مجروحؔ نے — ہو گیا آنکھوں سے اوجھل آفتابِ شاعری

١٣٥٤ھ

[1] اخبار سرفراز لکھنؤ یکم ستمبر ۱۹۳۵ء (یکم جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ)

مجروح کا دوسرا قطعہ تاریخ[1]

تیسویں[2] جولائی کو جب عمر کا ہنگام آیا
گونج اٹھا شیون و فریاد سے ایوانِ عزیز

بیچ میں پیکرِ بے روح تھا پُر حسرت و یاس
گرد تھے نوحہ کناں سارے عزیزانِ عزیز

دیکھنے والوں کے دل ہل گئے فرطِ غم سے
گھر سے روتے ہوئے جب نکلے یتیمانِ عزیز

رنج ہے دل کو نہ پہونچے دمِ آخر افسوس
سنتے کانوں سے ہم اپنے کوئی فرمانِ عزیز

قبر تک لاش کے ہمراہ گئے ناصرِ دیں
اے زہے منزلت و جاہ رہے شانِ عزیز

کلکِ مجروح نے تاریخ کا مصرعہ یہ لکھا
سنگدل موت نے لوٹی ہے عجب جانِ عزیز

۱۳۵۴ھ

ڈپٹی جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے اپنے استاد کے انتقال پر ایک مرثیہ کہا ہے جو انجم کدہ میں طبع ہو چکا ہے۔ جو حضرات اسے پڑھنا چاہیں انجم کدہ کا مطالعہ کریں۔ اثر نے ایک نوحہ بھی لکھا ہے جو راقم کو جناب اختر سلطانہ بنت عزیز لکھنوی سے حاصل ہوا۔ یہ نوحہ غیر مطبوعہ ہے، اس میں سترہ شعر ہیں۔ کچھ شعر پیشِ ناظرین ہیں:۔

چین آتا نہیں عزیز عزیز
جب سے اوجھل ہوئے نظر سے تم

میں کروں آہِ نارسا کب تک
کھینچ لو تیر یہ جگر سے تم

---

[1] یہ قطعہ جناب عزیز کے فرزند جناب حیات لکھنوی سے راقم کو حاصل ہوا

[2] عزیز کی وفات ۲۹ جولائی کو ہوئی تھی۔ جناب مجروح کو تدفین کی خبر پہونچی ہو گی وہ سمجھے ہوں گے کہ اسی دن وفات بھی ہوئی۔ قطعہ کے چوتھے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر عزیز کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہو سکا۔

شاد مجھ خستہ جاں کو کرتے تھے نامہ سے خیر سے خبر سے تم
خُلق سے مہر سے مروت سے پیش آتے تھے ہر بشر سے تم
ہائے غربت پسند آئی ہے یا تو گھبراتے تھے سفر سے تم
نیچے رو رو کے ہوتے ہیں ہلکان اور سوتے ہو بے خبر سے تم
عید اک دن تھا میرا نظّارہ آنکھیں پھیرے ہو یا ادھر سے تم
مر گئے تم عزیز آہ عزیز لے گئے لطفِ زیست اثر سے تم

سید حافظ حسین صاحب اسیر سندیلوی نے منظوم نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ نظم میں ستائیس شعر ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:-

تیرہ و تاریک کیوں ہے یہ شبستانِ جہاں رو رہا ہے کس کے غم میں آج ہر پیر و جواں
بن گئی ماتم کدہ دنیا ادب کی کس لئے کیوں نظر آتے ہیں شاعر آج مصروفِ فغاں
سب کے سب موجود ہیں بزمِ ادب میں اے اسیر ہاں نظر آتے نہیں بس اک عزیزِ نکتہ داں
شاعری میں جو تھا یکتا وہ ادیب نکتہ رس جس کو دیتی تھا زباں دانی کا وہ معجز بیاں
پیرویِ میر و غالب شاعری میں جس نے کی خسرو ملکِ سخن کہلایا استادِ زماں
جس کو کہتا تھا زمانہ ماہر فن نکتہ سنج جس کی نظمیں اور قصائد آج ہیں وردِ زباں
جب یتیموں کی طرف سے نظم جلسہ میں پڑھی خوں کے آنسو رو دیا جس نے سنی وہ داستاں
جس کا ہر اک شعر گویا خود سراپا درد تھا میر سے ملتا ہوا تھا جس کا انداز بیاں
حافظِ شیراز اور عُرفی کی گو تقلید کی پھر بھی اپنے رنگ کا موجد تھا وہ شیریں بیاں
قوم کی یہ بدنصیبی ہے جو اے شیریں سخن ہو گیا ہمدرد تجھ سا سب کی نظروں سے نہاں

۱؎ سرفراز لکھنؤ ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء

قوم کو نقصان جو پہنچا ہے تیری مرگ سے ہو بھلا اُس کا بیاں الفاظ سے ممکن کہاں
یہ دعا ہے اب اسیرِ غم کی اے ربِ جلیل دامنِ رحمت میں ہو تیرے عزیزِ نکتہ داں

مجلس چہلم | بتاریخ ۲۵ اگست ۱۹۳۵ء بروز یکشنبہ بوقت ۹ بجے صبح حسینیہ جناب غفرانمآب طاب ثراہ میں مجلس عزا بتقریب چہلم منعقد ہوئی جس میں مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی رونق افروز منبر ہوئے۔ مجلس میں مجتہدین، علماء، اعزا، احباب، تلامذہ، شعرا، ادباء اور عقیدت مندوں کا مجمع تھا سب کے چہروں سے غم و الم کے آثار نمایاں تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مرنے والا بہت ہی ہر دلعزیز تھا۔[1][2]

سنگِ مزار | عزیز کے مزار پر قبر ہی کے سائز کا کتبہ لگا ہوا ہے جس پر ان کی ولادت کی تاریخ ۵ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء لکھی ہوئی ہے۔ "وفات بوقت مغرب ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء" درج ہے۔ وفات کی تاریخ کے بعد سنگِ مزار پر عزیز کا ایک شعر لکھا ہے ؎

قبرِ عزیز دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ دل
یہ تو کسی شہید کی آرام گاہ ہے

اس کے بعد سب انسپکٹر پولیس محمد لیٰسین تسکینؔ سورونوی کا قطعۂ تاریخ کندہ ہے جو اس طرح ہے:۔

---

[1] رقعۂ چہلم منجانب ابو محمد۔ محمد مہدی، محمد صادق، محمد جعفر ابنائے جناب عزیز لکھنوی مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔

[2] زبانی مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی (مرحوم)

شاعرِ نغز گو لسان الہند — ناظمِ خوش بیان ادیبِ زمان

نکتہ دان، نکتہ سنج، نکتہ فروز — اہلِ دل ۔ اہلِ ذوق، اہلِ زبان

بہ معانی سخن دُرِ یکتا — بہ تخیل یگانۂ دوراں

فخرِ اربابِ علم و قوم و وطن — نازشِ لکھنؤ و ہندوستاں

مولوی میرزا عزیز کہ بود — از قبولِ سخن عزیزِ جہاں

بہ ندائے عزیز جانِ عزیز — داد و شد راہیٔ ریاضِ جناں

بہرِ تاریخِ رحلتش تسکیںؔ — طبع چوں گشت سلسلہ جنباں

پنج یار از رہِ عقیدت غم — گفتِ دل ۔ کل من علیہا فان

۵ + ۱۹۳۰ = ۱۹۳۵ء

GRAVE STONE OF AZIZ LAKHANAVI,
Bagh Khajuva, Shastri Nagar, Lucknow

تاریخ وفات میں اختلافات

عزیزؔ لکھنوی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ جتنے قلم اتنی تاریخیں
جو مختلف تاریخیں میری نظر سے گذریں وہ مع حوالہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) ۲۶ر جولائی ۱۹۳۵ء کو میرے پدر بزرگوار نے رحلت فرمائی[۱]

(۲) روز بست دہفتم ماہ ربیع الآخر میں عزیز ۱۳۵۴ھ گیا دنیا کو کہکر خیر باد[۲]

(۳) راجہ محمد نواب علی خاں نے ۲۸ر جولائی ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا
دوشنبہ کو سہ پہر کے وقت راجہ صاحب کی تدفین انجام پائی تھی کہ شب
سہ شنبہ میں لکھنؤ کے مشہور و ممتاز ادیب جناب مرزا محمد ہادی
صاحب عزیزؔ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا سہ شنبہ کی صبح کو حضرت عزیزؔ
کا جنازہ آپ کے ذاتی مکان سے نہایت عزت و احترام کے ساتھ

---

[۱] انجم کدہ صفحہ ۳ مرتبہ جناب حیات لکھنوی (عزیزؔ لکھنوی کے فرزند)
[۲] محشر لکھنوی از سرفراز لکھنؤ ۲۷ر اگست ۱۹۳۵ء

پاٹانالہ کے غسل خانہ میں لایا گیا جہاں تجہیز و تکفین کی گئی اس کے بعد میت بمقام کھجوا دفن ہوئی ؎[۱]

(۴) وفات بوقت مغرب ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء ؎[۲]

(۵) تیس جولائی کو جب عصر کا ہنگام آیا گونج اٹھا شیون فریاد سے ایوان عزیزؔ ؎[۲]

(۶) تیس جولائی سنہ ۱۹۳۵ء کی شب کو انتقال کیا ؎[۴]

(۷) عزیزؔ صاحب کا انتقال ۳۰ جولائی کو پیر کے دن شام کے وقت ہوا ؎[۵]

(۸) ۳۱ جولائی کو لکھنؤ کے مشہور و معروف ادیب اور شاعرِ نغز گو مولانا ہادی صاحب کا بھی انتقال ہو گیا ؎[۶]

(۹) اسی مرض میں ۲ اگست سنہ ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا ؎[۷]

اسی طرح عزیزؔ کی وفات کی اور بھی مختلف تاریخیں ناظرین کے علم میں ہو سکتی ہیں۔ لیکن تاریخ تو ایک ہی صحیح ہو گی۔ تجزیہ کے بعد انشاء اللہ ناظرین صحیح تاریخ وفات پر متفق ہو جائیں گے۔

؎۱ سرفراز لکھنؤ ۳ اگست سنہ ۱۹۳۵ء

؎۲ عزیزؔ لکھنوی کا سنگِ مزار

؎۳ ذریعہ دن مرزا صاحب مجروح لکھنوی لائف سکریٹری انجمن اصلاحِ ادب منصور نگر لکھنؤ کا ایک قلمی نسخہ

؎۴ رسالہ ادب دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء (آغا اشہر صاحب لکھنوی کا مضمون)

؎۵ زبانی بیوہ عزیزؔ

؎۶ رسالہ زمانہ کانپور جولائی سنہ ۱۹۳۵ء

؎۷ تنقیدیں از ادیس احمد ادیب ص ۵۵

وفات کی تاریخوں کا تجزیہ

تاریخ نمبرا:۔ عزیز کی وفات کے وقت جناب حیات کی عمر چار یا پانچ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ اپنے والد کے انتقال کی تاریخ انھوں نے بھی دوسروں سے معلوم کی ہوگی لہٰذا معتبر نہیں ہے۔

تاریخ نمبر۲:۔ محشر لکھنوی حلقۂ عزیز کے ایک خاص رکن تھے۔ ایک ذی علم اور ذمہ دار شخصیت تھی۔ عزیز سے بہت محبت کرتے تھے۔ خبر وفات سنتے ہی شدید صدمہ پہونچا ہوگا۔ زود گو شاعر تھے ہی۔ ہوسکتا ہے شعر مذکورہ فوراً نظم ہو گیا ہو۔ ۲ ربیع الآخر کو ۲۹ جولائی تھی جس کی تحقیق جنتری سے کر لی گئی ہے۔ لکھنؤ کے "سرفراز" اخبار نے بھی یہی تاریخ شائع کی ہے۔ لہٰذا یہ تاریخ قابلِ یقین ہے۔

تاریخ نمبر۳:۔ سرفراز پریس عزیز صاحب کے گھر سے بہت نزدیک ہے۔ خبر وفات فوراً ہی پریس پہنچ گئی ہوگی۔ یک شنبہ کو مذکورہ راجہ صاحب کا انتقال اور ۲۹ جولائی کو بروز دو شنبہ ان کی تدفین کے بعد عزیز کی خبر وفات اِن دونوں دل شکن حادثات کا ایسا اتصال ہو گیا کہ کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں۔

تاریخ نمبر۴:۔ سنگِ مزار پر جب تاریخ وفات لکھوائی جاتی ہے اس وقت صحتِ تاریخ خاص توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ یہ تاریخ جنابِ عزیز کے بڑے فرزند ابو محمد صاحب نے لکھوائی ہے جو اپنے والد کی وفات کے وقت تقریباً بیس سال کی عمر کو پہونچ چکے تھے تجہیز و تکفین، سیوم اور جملہ رسوم بعد الموت کو انجام دینے والا ان کے علاوہ کون ہوسکتا تھا۔ عزیز کی بیماری۔ علاج، بعدِ وفات گھر کا ہنگامہ

اعزا اور احباب کو خط لکھ کر سانحہ سے مطلع کرنا وغیرہ ایسے دلسوز حالات ہیں جنھوں نے تاریخ وفات کی مہر موصوف کے دل و دماغ پر لگا دی ہو گی۔ تاریخِ وفات نے اپنی دل شکن اور روح فرسا شکل ابو محمد صاحب کو بار بار دکھلائی ہو گی۔ ان حالات کی روشنی میں ابو محمد صاحب کی لکھی ہوئی تاریخ وفات صحیح معلوم ہوتی ہے جس کی تصدیق جناب محشر کے قطعۂ تاریخ اور سرفراز اخبار کی دی ہوئی خبر سے بھی ہوتی ہے۔

تاریخ نمبر ۵: فریدوں مرزا صاحب بوقت وفات لکھنؤ میں موجود نہیں تھے جس کا تذکرہ خود انھوں نے اسی قطعہ[1] میں کیا ہے۔ تدفین کی تاریخ کو وفات کی تاریخ بھی سمجھ بیٹھے۔

تاریخ نمبر ۶:۔ آغا اشہر صاحب نے بھی تدفین کی تاریخ کو وفات کی تاریخ سمجھ لیا اس لیے کہ جس دن انتقال ہوتا ہے پہلی کوشش متعلقین کی ہوتی ہے کہ جلد از جلد تدفین ہو۔ عموماً اسی دن تدفین ہو بھی جاتی ہے لیکن تدفین کا جلد انجام پانا بہت کچھ وفات کے اوقات پر منحصر ہوتا ہے۔ عزیزؔ کا انتقال بعد مغرب ہوا تھا لہٰذا اُسی دن دفن ہونا بہت مشکل تھا اور دوسرے دن دفن ہوئے۔ اس طرح تدفین کی تاریخ کو وفات کی تاریخ سمجھنا غلط تھا۔

تاریخ نمبر ۷:۔ بیوہ عزیزؔ کا بتایا ہوا پیر (دوشنبہ) کا دن صحیح ہے لیکن اس روز ۳۰ جولائی نہ تھی بلکہ ۲۹ جولائی تھی۔ دن اور تاریخ

---

[1] یہ قطعہ قطعات تاریخ وفات کے ضمن میں درج ہے۔

آپس میں لڑ رہے تھے۔ دن صحیح ہے یا تاریخ۔ دن سات ہوتے ہیں اور تاریخیں اکتیس تک جاتی ہیں۔ عورتوں کو بہ نسبت تاریخ کے دن زیادہ صحیح یاد رہتے ہیں۔ یوم وفات دوشنبہ تھا یہ بالکل صحیح ہے مگر تاریخ غلط ہے ہو سکتا ہے کہ فریدوں مرزا صاحب اور آغا اشہر صاحب نے تاریخ وفات بیوہ عزیز ہی سے معلوم کی ہو اور دن تاریخ کے اختلاف پر ان کی نظر نہ گئی ہو.....

راقم کو بھی بیوۂ عزیز نے پورے یقین کے ساتھ تبلایا تھا کہ عزیز صاحب کا انتقال ۳۰ جولائی ۱۹۳۵ء بروز دوشنبہ بوقت مغرب ہوا تھا۔ راقم نے دن اور تاریخ کی تصدیق کے لئے جنتری دیکھی تو دونوں میں اختلاف ظاہر ہوا اگر اشہر اور فریدوں نے وفات کی تاریخ بیوۂ عزیز سے دریافت کی تو شاید انھوں نے دن اور تاریخ دونوں چیزیں دریافت نہیں کیں یا اگر ایسا کیا تو دونوں کے متحد الوقوع ہونے کی تصدیق نہیں کی۔

تاریخ نمبر ۸:۔ دیا نرائن نگم اڈیٹر زمانہ کانپور نے شاید عزیز کی سوم سے حساب لگایا جو ۲ اگست کو ہوئی تھی عام طور سے سوم تیسرے ہی دن کا مفہوم رکھتا ہے اس حساب سے وفات کی تاریخ ۳۱ جولائی نکلتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مجلس سوم تیسرے ہی دن ہو، اہل لکھنؤ مجلس سوم کے بطور تیجہ پانچویں دن کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ تاریخ وفات غلط ہے۔

تاریخ نمبر ۹:۔ اویس احمد ادیب حلیم ڈگری کالج کانپور میں تھے ۲ اگست ۱۹۳۰ء کو عزیز کی مجلس سوم ہوئی تھی کچھ عرصہ کے بعد ان کو یہ سہو ہو گیا کہ تاریخ سوم کو تاریخ وفات سمجھ بیٹھے۔

وفات کی مستند تاریخ بالآخر تاریخ وفات کی اس طولانی بحث کا تجزیہ کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ سنگ مزار پر ابو محمد صاحب کی لکھوائی ہوئی۔ جناب محشر کی کہی ہوئی اور

سرفراز اخبار کی شائع کی ہوئی تاریخ صحیح ہے اور ۲۹ جولائی ۱۹۳۵ء مطابق ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ کو بروز دوشنبہ وقت مغرب عزیز لکھنوی کا انتقال ہوا۔ اس سے مختلف وفاتِ عزیز کی ہر نشاندہی غلط ہے۔

باب دوم
ماحول

عزیز کا ماحول اپنے تہذیبی پس منظر کے ساتھ

لکھنؤ کی تہذیب میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر نہ صرف اپنے ہی ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی اس کی شہرت تھی۔ اپنی مثالی تہذیب کی وجہ سے شہرِ لکھنؤ کو ایک امتیازی شان حاصل تھی اس تہذیب کی تعمیر شاہانِ اودھ کی سرپرستی میں ہوئی۔ اس میں ایسی دل نشیں کشش اور لطافت تھی کہ تاجدارِ اودھ کی معزولی کے بعد بھی عرصۂ دراز تک حضراتِ لکھنؤ اپنی پرانی تہذیب کو سینہ سے لگائے رہے۔ بقول ڈاکٹر سید صفدر حسین:-

"اس زندہ تہذیب نے بغیر سرپرستیٔ دربار بھی تقریباً نوے سال تک اپنے وجود کا ثبوت دیا"[1]

---

[1] لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص۲۹۳

قدیم لکھنؤ کی آبادی تین طبقوں میں تقسیم تھی۔ ادنیٰ طبقہ میں مزدور کہار اور چھوٹے دوکاندار شامل تھے۔ دوسرا طبقہ متوسط لوگوں پر مشتمل تھا۔ اِن میں اعلا ملازمت والے، بڑے صنعت گر اور رؤسا کے مصاحبین کو شمار کیا جاتا تھا۔ شرفائے لکھنؤ کا اطلاق انھیں لوگوں پر تھا۔ شعرا اور ادبا کی گنتی بھی انھیں لوگوں میں تھی یہ لوگ اپنی قلیل آمدنی کے باوجود اپنی سلیقہ مندی سے سفید پوشی پر کوئی دھبہ نہیں آنے دیتے تھے۔ بلا امتیازِ مذہب و ملت سب لوگوں کا قریب قریب ایک جیسا رہن سہن مزاج اور طور وطریقہ تھا۔ سب کی ایک زبان اردو تھی جس سے ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی محبت کرتے تھے اور اسے فروغ دینا چاہتے تھے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کا بھی اچھا خاصا رواج تھا۔ بعض اہلِ ہنود حضرات بھی فارسی کے زبردست ادیب تھے اور عربی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ زبان کے مسئلہ میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ شہر کے رئیسوں، امیروں، نوابوں اور شہزادوں کا تھا جن میں نامور اطبّا اور تجار بھی شامل کئے جاتے تھے شاہی ختم ہونے کے بعد شاعر اور ادیب انھیں امراء کے در دولت سے وابستہ ہوگئے۔ لکھنؤ کے رئیسوں نے یہاں کی تہذیب کو مرتے دم تک باقی رکھا۔

ادبی ذوق و شوق اتنا عام تھا کہ قریب قریب ہر رئیس مشقِ سخن کیا کرتا تھا۔ زیادہ تر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ بعض شعرا نعت و منقبت میں نظمیں یا قصیدے بھی لکھتے تھے ہر رئیس کے یہاں بیرونی نشست گاہ تھی۔ جس کو دربار کہتے تھے۔ دربار کے لئے علیٰحدہ اوقات

مقرر تھے۔ یہ دربار شہر کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے جن کا تذکرہ مرزا جعفر حسین نے اپنی تصنیف[1] میں تفصیل سے کیا ہے۔ دربار میں شاعروں اور مصاحبوں کا مجمع رہتا تھا اور گھنٹوں نشست رہتی تھی۔ مشغلہ، شعر و سخن ہی بہترین مشغلہ تھا۔ یہی طور و طریقہ بقول ڈاکٹر سید صفدر حسین[2] تقریباً تقسیم برصغیر تک باقی رہا۔

امیروں اور رئیسوں کے شاعرانہ مزاج اور ادبی مذاق سے مصاحبین اور دوسرے شرفا، زبان و ادب کی فنی لطافتوں کے اس قدر دلدادہ ہو گئے تھے کہ سارے شہر لکھنؤ پر شعریت اور موزونیت چھائی ہوئی تھی یہاں تک کہ پھیری والے اور خوانچے والے بھی اپنا سودا نثر موزوں میں بیچا کرتے تھے۔ آج بھی اکثر ریل گاڑیوں اور بس اسٹیشنوں پر سودا بیچنے والے نثر موزوں میں سودا بیچتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ یہ وہی پرانے لکھنؤ کی شعریت اور موزونیت کے دور کی یادگار ہے۔

تعلیمی معیار یہ تھا کہ بچہ اسکول میں پڑھے یا گھر میں ہر جگہ آمد نامہ، دستور الصبیان، کریما مامقیماں سے اس کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ اُن کتابوں کے ختم ہونے پر یکے بعد دیگرے حسب رواج وقت گلستاں، بوستاں اور پھر رقعاتِ عالمگیری کی باری آتی تھی۔ عربی تعلیم پر بھی اچھا خاصا زور تھا۔ مذکورہ بالا فارسی کتابوں کے ساتھ میزان، منشعب، کافیہ

---

[1] بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۲۹۳

اور شافیہ وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ حافظ، خاقانی، فردوسی، جامی، نظامی اور ساتھ ہی ساتھ سبعہ معلقات تک پڑھوا کر تعلیم ختم کر دی جاتی تھی۔ اردو باقاعدہ طور پر نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ گھر کا ماحول ہی اردو کی درسگاہ تھا۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:۔

"اس زبان کی تعلیم گھر کے ماحول اور آغوشِ مادر میں مل جاتی تھی، راقم الحروف کو نیز برادرم جعفر علی خاں اثر مرحوم کو غالب اور عرفی کی غزلیں اور قصائد میرے ہی والد مرحوم نے پڑھائے تھے اُسی تعلیم کا لطف اور افادہ زندگی بھر شریکِ حال رہے گا"[1]

بزرگ اپنے بچوں کو تعلیم برائے علم و اخلاق دلواتے تھے۔ لہذا جغرافیہ۔ تاریخ۔ ریاضی اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف توجہ کم تھی۔ ادبی تعلیم نے اہلِ لکھنؤ کے مزاج میں نفاست، نزاکت اور لطافت بھر دی تھی۔ رفتار و گفتار، خوراک و پوشاک اور سیر و تفریح وغیرہ ایک خاص طرز کے ماتحت تھے اور فنونِ لطیفہ کے حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ ہر شعبۂ حیات میں فنکاری کے بہترین نمونے ملتے تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں:۔

"لکھنویت نام تھا مخصوص معتقدات میں استغراق کا، علم و فضل میں ایک خاص ترقی اور بالیدگی کا، تہذیب و تمدن میں نزاکت و لطافت کی تخلیق کا اور ہر شعبۂ حیات میں جدت و نفاست کا"[2]

---

[1] بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں ص ۱۵

[2] لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۲۸۴

۱۸۵۷ء کے طوفانِ فتنہ و فساد کے بعد بھی اِن رؤساء اور شرفاء کے وہی طور و طریقے رہے جو پہلے تھے۔ آمدنی کے راستے اب محدود ہو چکے تھے مگر رئیسوں نے اپنے امیرانہ ٹھاٹ باٹ میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ نئی قدروں کو نہیں قبول کر سکے۔ تغیرات کے باوجود وہ پرانی اور فرسودہ قدروں کو سینہ سے لگائے رہے۔ وہ اپنے طرزِ زندگی میں کسی ترمیم و تنسیخ کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تباہی کا طوفان آیا تو وہ اپنی حفاظت نہ کر سکے۔ ملک دفعتاً سائنسی اور مشینی زندگی میں بدلا۔ اس قسم کا ماحول اُن لوگوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ ان کی پرانی قدروں کا تعلق تہذیب و اخلاق اور انسان کے احساس و جذبات سے تھا لہٰذا وہ ہوا کے رخ پر نہ چل سکے اور اپنا طرزِ زندگی نہ بدل سکے۔ افلاس کی بلائیں ان کے سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ پر اُن کے اخراجات کا دارومدار رہا۔ جیسے جیسے خاندان بڑھتا گیا آمدنی محدود ہونے کی وجہ سے گھٹتی گئی۔ آمدنی کے نئے نئے وسیلے تلاش کرنا کسرِ شان سمجھا گیا۔ طبیعتیں چونچال تھیں۔ مزاج میں لا اُبالی پن تھا۔ دل فراخ تھا اور ہاتھ کشادہ۔ جب ذخیرۂ نقد ختم ہو گیا تو ادھار کی نوبت آئی۔ مہاجنوں کی قسمت چمکی۔ ایک ایک دے کر دس دس کے پرونوٹ لکھوائے۔ رئیسوں اور امیروں پر اقتدار اور وقار کا تصور بری طرح حاوی تھا۔ جو زبان سے کہہ دیتے تھے اس پر قائم رہتے تھے مقدمہ کی پیروی کے لئے کچہری جانا سخت توہین سمجھتے تھے۔ مہاجن کے گھر جانے میں اس لئے اپنی ذلت نہیں سمجھتے تھے کہ وہ بہت عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کرتا تھا۔ جو مال و زر رؤساء کے پاس

تھا رفتہ رفتہ مہاجنوں کے گھر پہونچ گیا۔ رئیس بیچارے اپنی وضعداری آن بان اور شرافت و دیانت کے غلط تصور پر مر مٹے۔ وہ اپنی کمزوریوں کو ہمیشہ عین صداقت اور حق پرستی جانتے رہے۔ اسی احساس نے ان کو تباہی کے گھاٹ اُتار دیا۔

رؤسائے لکھنؤ کی ریاست کے ساتھ شہر کی کچھ انمول قدریں بھی روانہ ہوگئیں۔ اس نقصان کی تلافی کرنا اب لکھنؤ والوں کے لئے بہت مشکل ہے۔ لکھنؤ کے کلچر کی بنیاد مذہبی رواداری پر تھی۔ فرقہ واریت کہیں نام کو نہ تھی آپس میں برادرانہ تعلقات تھے، آداب تکلفات اور وضع و قطع سے کسی کا مذہب معلوم کرنا مشکل تھا۔ تمام فرقے آپس میں شیر و شکر تھے۔ لکھنؤ کا یہ سارا اتحاد و اتفاق جادوئے فرنگ نے غائب کر دیا جس پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

اولاً شہر لکھنؤ میں فرنگی محل کے علمائے دین کا طبقہ تھا۔ سربراہانِ مملکت تک ان کی عزت کرتے تھے۔ یہ لوگ یگانۂ روزگار تھے۔ دور دور سے تشنگانِ علم و معرفت آتے تھے اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ علوم کے حاصل کرنے میں مذہب و ملت کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ عہد آصف الدولہ میں مولوی دلدار علی نصیر آبادی اور اُن کی اولاد نے مراجع دین کی حیثیت سے شہرت پائی۔ شیعوں میں شہر کا پہلا خاندان اجتہاد یہی تھا۔ اس کے بعد مولوی حامد حسین صاحب کا خاندان کنتور (ضلع بارہ بنکی) سے آکر لکھنؤ میں بس گیا۔ مولانا نجم الحسن شہر کے تیسرے خاندانِ اجتہاد کی روحِ رواں تھے۔ یہ تینوں خاندان عربی و فارسی اور دینیات پر پوری طرح حاوی تھے۔ ان علماء کا انہماک پیغمبر اسلام کے نواسہ امام حسینؑ کی عزاداری میں بہت رہتا تھا۔ شاہانِ اودھ نے بھی

نواسۂ رسول کا غم منانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ ہندو مسلم، شیعہ سنی سب مل کر تعزیہ داری کرتے تھے۔ تعزیہ سازی بھی ایک فن بن گیا تھا۔ سارا شہر عشرۂ محرم میں تصویرِ حزن و ملال ہو جاتا تھا۔ شاعر کے دل کا متاثر ہونا فطری تھا۔ یہی تاثر تھا جو اس کے کلام میں سوز و گداز بن کر داخل ہو گیا۔ مرثیہ نگاری کو بہت فروغ ہوا۔ سلام و رباعی پر قریب قریب ہر شاعر طبع آزمائی کرتا تھا۔ انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کو فنی محاسن سے اس طرح مالا مال کر دیا کہ اُن کے اخلاف و تلامذہ میں یہ فن مدتِ مدید تک باقی رہا اور لوگ اس کی قدر کرتے رہے۔ افسوس کہ یہ فن بھی اب اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔

عہدِ شاہی کے آخری دور میں لکھنؤ مرکزِ شاعری بن گیا تھا۔ شاعری بالعموم درباروں سے وابستہ تھی۔ انشاؔ و مصحفیؔ اور ناسخؔ و آتشؔ نے رئیسوں کے انعام و اکرام سے مرعوب ہو کر اپنی خودداری کو خیرباد نہیں کہا لیکن اُن کے بعد اُن کے شاگردوں اور دوسرے شعرا نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ وہ اپنے کرم فرماؤں کے رجحانِ طبع کا احترام کریں۔ اُن کے جذبات کی تصویریں کھینچیں اور اپنی خداداد قوتِ شعری کو ان کی جمعیتِ خاطر کے لئے استعمال کریں۔ امیروں کی خوشنودی کے لئے اپنی انفرادیت کو مسخ کر دیا۔ شعرا کے اس طرزِ عمل سے اردو شاعری کو سب سے بڑا نقصان یہ پہونچا کہ اُس سے خیال کی پاکیزگی، مضمون کی بلندی، فکر کی گہرائی، صداقت اور روحانیت رخصت ہو گئی۔ شاعری سے وارداتِ قلبیہ کی مہذب تصویریں معدوم ہو گئیں۔ صاحبانِ دولت بالعموم تعیش پسند تھے۔ محفلِ رقص و سرود میں بیٹھ کر طوائف کے بناؤ سنگار، کنگھی

چوٹی اور خارجی محاسن سے اپنے دلوں کو خوش کیا کرتے تھے۔ طرزِ گفتگو بھی بہت دلکش اور پُر تکلف تھا۔ زبان کے لحاظ سے تو ضرور اِس دور میں شاعری کو فروغ ہوا۔ مگر شاعری کا خیالی پہلو پست ہو گیا۔ شاعرانہ شاعری زلفِ گرہ گیر محبوب میں پھنس کر رہ گیا۔ طائرِ تخئیل تیرِ نظر کا نشانہ بن گیا۔ پاکیزگیِ فکر تیغِ ابرو سے مجروح ہو گئی۔ شاعری پر عاشقانہ رنگ چھا گیا۔ قصیدوں میں نواب، وزیر یا کسی رئیس کی تعریف ہوتی تھی۔ غزلوں سے معشوقِ حقیقی کا تصور ہٹ گیا، اور شاہدانِ بازاری کی آرائش و زیبائش کا بیان ہونے لگا۔ قصیدوں اور غزلوں کا یہی طرز موجبِ اکرام و انعام ہوتا تھا۔ ابھی وہ عہد ہی نہیں آیا تھا کہ عوامی اور دیہاتی زندگی کے مسائل سے شعراء کو سروکار ہوتا۔ ان کی نظریں درباری مناظر سے کب فرصت پاتی تھیں کہ دیہات کی طرف دیکھتیں۔ شاعری میں شراب، ساقی، رقیبوں کے گلے شکوے عاشقوں کی حرماں نصیبی اور ہجر کی فلک کے جور و ستم اپنی بدقسمتی کا رونا اور حزن و یاس وغیرہ نظم ہوتے تھے۔ صنعتوں کا استعمال تصنع دور از کار تشبیہیں اور بے معنی مبالغے بکثرت ملتے ہیں۔ اردو شاعری کا یہ رنگ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بھی عرصۂ دراز تک قائم رہا۔

لکھنؤ کے مخصوص ماحول سے قطع نظر کرکے اگر سارے ملک کے ماحول کو دیکھا جائے تو سیاسی ہلچل اپنے شباب پر دکھلائی دیتی ہے ہندوستان کی معاشرت پر مغربی رنگ چڑھ رہا تھا۔ جگہ جگہ انگریزی اسکول کھل رہے تھے۔ جہاں پردے پردے میں عیسائیت کی تبلیغ

ہو رہی تھی۔ ہندوستانیوں کے اتحاد و اتفاق کو انگریز طرح طرح کی حکمت عملیوں سے توڑ رہے تھے۔ اسی عبوری دور میں اردو ادب کو حالی آزاد اور شبلی جیسے مدبر مل گئے۔ یہ لوگ اردو کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت بھی کرنا چاہتے تھے۔ اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو مغربی طوفان سے بچانے کا رجحان عام ہوا۔ قوم کی اقتصادی حالت کو درست کرنے کی فکر پیدا ہوئی۔ اس وقت کے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں:-

"...انیسویں صدی کے آخری حصہ میں اردو ادب میں تین رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جس پر جاگیردارانہ نظام کی چھاپ ہے۔ دوسرا جس میں متوسط طبقہ کے تصورات کا عکس ہے اور تیسرا جس میں عوامی زندگی کی دھندلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے..... یہ رجحانات ایک دوسرے سے اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ آج ان کے تاروں کو الگ الگ کرنا آسان کام نہیں ہے.......

بیسویں صدی کے شروع میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو رومانی عقلیت کہا جا سکتا ہے اس میں ایک طرف ہندوستان کی کھوئی ہوئی عظمت کی یاد۔ دوسری طرف مسلمانوں کے شاندار ماضی کا بیان اور ان سب کے ساتھ ساتھ ایک جدید نقطۂ نظر کی تلاش اور سماجی اصلاح کی کوشش اس تحریک کے مختلف پہلوؤں کی جھلک آپ کو شبلی، حالی، چکبست، اقبال، عبدالحلیم شرر، سرشار

پریم چند، مہدی افادی۔ ابوالکلام آزاد، جوش۔ قاضی عبدالغفار سجاد حیدر، نیاز فتحپوری، لطیف الدین احمد اور بہت سے بڑے چھوٹے ادیبوں کی نظم و نثر میں دکھائی دیگی[۱]"

ادب میں ان رجحانات کو پیدا کرنے والے ملکی حالات و تغیرات سے لکھنؤ الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر چہ اس وقت بھی یہ علم و فن، تہذیب و تمدن، نفاست و شائستگی اور شعر و شاعری کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بعض رئیسوں کی سلیقہ مندی اور وسیع النظری کی وجہ سے امارات کے کچھ نمونے بھی موجود تھے مگر مغربیت لکھنؤ کی پرانی تہذیب پر بھی رفتہ رفتہ اثر انداز ہو رہی تھی، ادب، مذہب اور سماج نئے حالات سے دو چار تھے۔ انھیں حالات میں لکھنؤ کے افق شاعری پر صفی، ثاقب، محشر، آرزو، دانش، اثر، چکبست اور نوبت رائے نظر کے درمیان عزیز بھی نمودار ہوئے۔

ان سب شعرا کو اساتذہ کا درجہ حاصل ہوا، ان سب کو مالی پریشانیاں رہتی تھیں سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی سب شعرا کے لئے نہیں کھلے تھے۔ اثر، چکبست اور صفی کو ملازمت مل گئی۔ شہر کے دوسرے شعرا صاحبانِ دولت کی طرف چلے گئے محشر شہر کے مشہور وکیل شیخ علی عباس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے۔ عزیز مرزا عباس علی خاں ڈپٹی کمشنر کے دربار میں پہنچ گئے ان کے یہاں شعرا کا مجمع رہا کرتا تھا۔ خود بھی شاعر تھے اور جگر تخلص

---

[۱] اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر ص ۱۲-۱۵

تھا۔ عزیز کے علاوہ کلیم اور آرم بھی اسی دربار سے متعلق تھے۔ صفی، محشر، بلیغ، فصاحت اور حامد علی خاں بیرسٹر بھی یہاں کی ادبی محفلوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہ محفلیں بڑی شائستہ اور مہذب ہوتی تھیں مرزا عباس علی خاں کے انتقال کے بعد عزیز ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور امین آباد ہائی اسکول (موجودہ انٹر کالج) لکھنؤ میں معلم مقرر ہوئے۔ اوقات فرصت میں عزیز کی نشستیں اثر لکھنوی، مودب لکھنوی اور علمائے دین کے یہاں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں علمی اور دینی گفتگو رہتی تھی عزیز کا کچھ وقت انجمن معیار کے دفتر میں گذرتا تھا اس کے علاوہ چوک لکھنؤ میں تاجدار مرزا کی دکان پر بھی جایا کرتے تھے[1] جہاں شہر کے بہت سے شاعر اور ادیب جمع ہوا کرتے تھے۔ یہاں بھی شعر و شاعری کا اچھا خاصا مشغلہ رہتا تھا۔ کلام پر تنقیدیں ہوتی تھیں۔ لکھنؤ کے محلہ نخاس میں مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد کے یہاں چہاردہ معصومین کی تاریخ ولادت پر محفلیں ہوتی تھیں۔ عزیز ان محفلوں میں شریک ہونے کے علاوہ بھی مولانا کے یہاں برابر حاضری دیتے تھے۔ یہاں کی مقاصدہ کی محفلوں میں عزیز کا قصیدہ پڑھنا لازمی تھا۔ جس طرح مرزا عباس علی خاں کے یہاں عزیز کی غزل گوئی مقبول تھی مولانا کے یہاں قصیدہ گوئی نے سب کو گرویدہ بنا لیا تھا۔

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی ختم ہوتے ہوتے والیٔ محمود آباد کے علاوہ تمام رئیسانِ لکھنؤ مفلوک الحال ہو گئے، شہر میں راجہ صاحب

---

[1] زبانی جناب فضل نقوی لکھنوی

محمود آباد کے تین محل تھے جن سے شہر کے کچھ شاعر اور ادیب وابستہ ہو گئے مثلاً مرزا محمد عسکری ادیب اور ثاقبؔ لکھنوی بٹلر پیلس (BUTLAR PALACE) حضرت گنج سے متعلق تھے۔ صفیؔ اور ظریفؔ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ سے تعلق رکھتے تھے۔ محشرؔ، اقبال منزل، وزیر گنج سے وابستہ تھے[1] عزیزؔ لکھنوی کو محمود آباد اسٹیٹ ضلع سیتاپور میں مقرر کیا گیا۔

اگر عزیزؔ کے ماحول کو بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ وہ علما اور رؤسا، شعرا، اُدبا، صحافی، طلبہ، اطبّا اور دیگر عقیدتمندوں سے متعلق رہے۔ علما میں فرقوں کی تفریق نہیں تھی۔ علمائے اہلِ سنت میں مولانا عین القضاۃ، مولانا عبد المجید فرنگی محلی، مولانا عبد الحمید فرنگی محلی اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی تھے۔ علمائے شیعہ میں مولانا حامد حسین مولانا ناصر حسین، مولانا نجم الحسن، مولانا محمد ہارون، مولانا فرمان علیؒ، مولانا سید سبط حسن، مولانا سید محمد باقر، مولانا سید علی نقی، مولانا سید محمد، مولانا سید علی، مولانا سید ابن حسن نونہروی تھے جن کی ذواتِ مقدسہ محتاج تعارف نہیں۔ اسی حلقہ کے فیض سے عزیزؔ کا علمی معیار بہت بلند تھا۔ اکثر معاصرین ان کو مولانا عزیزؔ کہنے لگے تھے۔ وہ اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ تھے۔ مدرسۂ ناظمیہ شیعہ کانفرنس، شیعہ یتیم خانہ اور مدرسۃ الواعظین سے ایک قلبی لگاؤ تھا۔ اسی ماحول کے زیر اثر عزیزؔ نے اپنے فن پاروں میں کہیں کہیں عربی اور فارسی کے ادق اور غیر مانوس الفاظ، محاورات

---

[1] بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں ص ۵۸
[2] اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں ترجمہ کے متعلق عزیزؔ کی تقریظ کا ذکر تفاخر کے ساتھ کیا ہے۔

اور اصطلاحات استعمال کئے ہیں۔ مرزا محمد عباس علی خاں اور راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں رہ کر رئیسانہ انداز اپنائے۔ کسی سے بے تکلف ہو کر نہیں ملتے تھے۔ بہت دیر آشنا تھے اور اسی ماحول میں رہ کر عزیز کے ادبی ذوق میں پختگی، مزاج میں شائستگی اور فکر میں گیرائی آئی۔ شعرا میں اکبر الہ آبادی، شیخ مہدی حسن ناصری، حامد علی خاں بیرسٹر[1]، مودب رشید، صفی، ظریف، آرزو، محشر، آثر اور چکبست تھے۔ وحشت کلکتوی اور شاد عظیم آبادی سے بھی کافی رسم و راہ تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی بھی بڑی عزت کرتے تھے۔ اکبر اور اقبال سے عزیز بہت متاثر تھے اور یہ دونوں عظیم المرتبت شاعر بھی عزیز کی قدر کرتے تھے[2]۔ انھیں کے زیر اثر عزیز کے کلام میں جذبۂ قومی اور فلسفیانہ خیالات کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صفی کی

---

[1] یہ انگریزی اور اردو دونوں ادب کی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ انگلینڈ کے معیاری رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ لندن میں ان کی سوسائٹی وزیر اعظم برطانیہ گورنر جنرل، نامی ادیب اور شاعر مشہور بیرسٹر، ممبر پارلیمنٹ اور لارڈ وغیرہ پر مشتمل تھی۔ تفصیل کے لیے واقعات انیس از احسن دیکھئے۔

[2] عزیز کا شعر :- اکبر حکیم و نبض شناس زمانہ ہے اقبال اپنے طرز سخن میں یگانہ ہے

[3] اکبر کا شعر :-

لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کو عزیز زندگی ہم عزیز کو سمجھے

اقبال کا قطعہ :-

دریوزۂ ذوق شوق عزیز غزل طراز ساز آں چنانکہ خستہ جان فن گرافت

آں گریہ ہا کہ بودگرہ در ضمیر عشق آں در و شتاب زدہ دانہ دانہ ساخت

انجمن اصلاحِ تخییل کی وجہ سے عزیز کی غزلوں میں سادگی اور صداقت آئی۔ ادیبوں میں مرزا محمد ہادی رسوا، شبلی، سید سلیمان ندوی اور عبدالماجد دریابادی تھے جن سے عزیز وابستہ تھے۔ ان لوگوں کے اثر سے عزیز کے اندر تنقیدی شعور کی شمع روشن ہوئی اور نثر نگاری سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ شبلی اور سلیمان ندوی سیاست عصر سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ندوی تو تحریکِ خلافت کے ایک خاص رکن تھے۔ اس تحریک اور طرابلس بلقان مشہدِ مقدس اور روضۂ امام رضا پر ہونے والے اتحادیوں کے حملے سے عزیز بھی بہت متفکر تھے جس کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے۔ صحافیوں میں جالب دہلوی، عبدالماجد، ناصر علی خاں بہادر، محمد معین حسن اور دیا نرائن نگم وغیرہ[1] تھے۔ عزیز نے بھی "الواعظ لکھنؤ" کی ادارت کی۔ امین آباد ہائی اسکول میں درس و تدریس کے ذریعہ طلبہ کی تعلیمی دشواریوں کو سمجھا اور ان کے لیے درسی کتابوں کی تالیف کی۔ اطبا میں حکیم عبدالعزیز، حکیم سید علی آشفتہ اور حکیم صاحب عالم سرفہرست ہیں۔ اس حلقہ میں رہ کر عزیز نے اپنے الفاظ کے ذخیرے کو بڑھایا اور ادبی صنفوں پر جلا کی۔ عقیدتمندوں اور احباب کی فہرست بہت بڑی ہے جس میں عبدالحلیم شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، سید اکبر مہدی حلیم جرولی (ضلع بہرائچ) سید محمد رضا صاحب کنتوری (ضلع بارہ بنکی) نظم طباطبائی، ہوش بلگرامی، منیر آغا شہر، عبدالعلی شوق سندیلوی (مصنفِ اصلاحِ سخن) ڈی سی شاہجہانپوری اور جسٹس کرامت حسین وغیرہ تھے۔

عزیز کے اس متنوع ماحول میں علمی اور ادبی سرگرمیاں مشترک تھیں جس سے عزیز پوری طرح مستفیض ہوئے۔ ثبوت کے لئے عزیز کے کارنامے موجود ہیں جو نظم اور نثر دونوں اصناف پر مشتمل ہیں۔

---

[1] یہ لوگ بالترتیب "ہمدم" "ہمت" "سچ" "صدق" "صلائے عام" "مدینہ" "زمانہ" رسالوں کے اڈیٹر تھے۔

عزیز لکھنوی کا سلسلۂ شعر وفن

جس وقت عزیز نے شعر گوئی کی ابتدا، کی لکھنو شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا اس وقت یہ چار شاعر سید حسین میرزا عشق، قاری یعقوب علی خاں نصرت، مولوی لڈن صاحب خورشید اور نواب محمد باقر علی خاں عرف بنے صاحب مشاق بہت بلند سمجھے جاتے تھے جو علم عروض اور جملہ اصناف شاعری پر حاوی تھے اور یہی چاروں شعراء شہر کے چار پھاٹک کہے جاتے تھے۔ ان اساتذہ اور ان کے شاگردوں سے لکھنؤ کا بازار شعر وادب گرم تھا۔ان کے علاوہ برق، بحر، قلق، امیر، ادیب، انس، نفیس، تعشق، بقا، کامل، یاس، جلال اور صفی وغیرہ کے نغموں سے فضائے لکھنؤ گونج رہی تھی۔ ماحول کے اثر اور خداداد طبیعت نے عزیز کو بچپن ہی میں شاعر بنا دیا اور جوانی کے عالم میں ہی پیارے صاحب

لہ زبانی مہذب لکھنوی

رشید، دولھا صاحب عروج اور سید علی محمد عارف جیسے اساتذہ کی فہرست میں شامل کر لیے گئے۔ عزیز کی عمر جب بیس اور پچیس سال کے درمیان[۲] تھی اُسی وقت سے مرزا عباس علی خاں جگر لکھنوی[۱]، اثر لکھنوی[۲]، اور روآں اناوی[۳] اپنا اپنا کلام عزیز کو دکھلانے اور اُس پر اصلاح لینے لگے تھے۔

عزیز کے اساتذہ۔ جاوید، مشتاق اور صفی۔ (جن سے عزیز نے مشورۂ سخن کیا)

عزیز نے سب سے پہلے سید محمد کاظم صاحب جاوید سے شرف تلمذ حاصل کیا[۴] مگر وہ پورا شعر ہی بدل دیتے تھے۔ یہ اصلاح عزیز کو پسند نہ آئی تو آپ نواب باقر علی خاں عرف بنے صاحب مشتاق کے شاگرد ہوئے[۵] اس کے بعد صفی سے مشورۂ سخن کیا[۶] بیس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے شرف تلمذ حاصل کرنے کی منزلیں ختم کر کے اساتذہ کی صف میں داخل ہو گئے۔

۱۔ گلکدہ ص۸

۲۔ اثرستان ص۱۹

۳۔ روحِ رواں ص۴

۴۔ زبانی ظفر حسن صاحب رضوی جو عزیز کے احباب میں تھے اور آج کل مدرسۂ ناظمیہ میں معلم ہیں۔

۵۔ دیوانجی ص۶۲، رسالۂ ادب دسمبر ۱۹۳۵ء

۶۔ ایضاً ص۶۲

جاویدؔ لکھنوی[۱] | جناب جاویدؔ کا نام سید محمد کاظم تھا مگر عام طور سے بندہ کاظم کہے جاتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب غفران مآب مولوی دلدار علی مجتہد تک پہونچتا ہے۔ مرحوم کی علمی اور فنی استعداد نہایت وسیع اور مستحکم تھی۔ تمام اصنافِ سخن پر قدرت تھی لیکن مرثیہ گوئی پر طبیعت زیادہ مائل تھی۔ اِن کے تلامذہ کی طویل فہرست میں حکیم سید علی آشفتہؔ، محشرؔ لکھنوی بیتابؔ، بہارؔ، جنوںؔ، صولتؔ، تمناؔ، رازؔ، سکندرؔ اور برقؔ (سب لکھنوی) وغیرہ شامل ہیں۔ جاویدؔ کا انتقال ۱۳۴۰ھ میں ہوا۔ عزیزؔ نے قطعۂ تاریخ کہا:-

خلفِ حضرتِ اُمید خلافِ اُمید	رفت ازیں عالم و پیوست بذاتِ جاوید
طائرِ روح پریداز قفسِ عنصریش	نقش بر صفحۂ دل ماند صفاتِ جاوید
دفترِ مدح و مراثی کہ ازو یاد نماند	آں سجل است سجل بہرِ نجاتِ جاوید
گنجِ اسرارِ معانی بہ زمیں شد پنہاں	خاکِ بے مایہ گراں شد زِ وفاتِ جاوید
گفت رضوانِ جناں سالِ وفاتش زعزیزؔ	یافت آں بندۂ مرحوم حیاتِ جاوید

۱۳۴۰ھ

مشتاقؔ لکھنوی[۲]:- | نواب محمد باقر علی خاں عرف نواب بنے صاحب مشتاقؔ نوابینِ اودھ کے خاندان سے تھے۔ وثیقہ اتنا ملتا تھا کہ خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔ علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ عربی اور فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ بہت سے شرفاء اور معززین انھیں سے درسیات پڑھتے تھے

۱؎ بازارِ سخن ص۹ اور ص۱۰

۲؎ سبدِ گُل (غیر مطبوعہ)

ایرانی سیاحوں کو مہمان رکھ کر ان سے اصطلاحات و محاورات سیکھا کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے جن میں منے آغا فاضل، الطاف حسین عالم، ناظم حسین ناظم اور عزیز لکھنوی شامل ہیں۔ جناب مہذب لکھنوی کے پاس ایک دیوان مشاق ہے جس میں اُن کے تلامذہ کے نام بھی ہیں۔ اس فہرست میں عزیز لکھنوی کا نام درج ہے۔[1] مشاق لکھنوی کا انتقال ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء (۱۶ شوال ۱۳۲۲ھ) بروز شنبہ ہوا، اور رامپور میں سپرد خاک ہوئے کیونکہ آخر عمر میں والیٔ ریاست رامپور کی قدردانی اور عزت افزائی کے پیش نظر رامپور چلے گئے تھے۔[2]

صفی لکھنوی | آپ کے متعلق تفصیلات جاننے کے لیے "صحیفۃ الولا" از صفی یا "صحیفہ" مرتبہ سید زائر حسین کاظمی ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کی مشہور و معروف ہستی محتاج تعارف نہیں۔ آپ عزیز لکھنوی کے استاد تھے یا نہیں یہ ایک اختلافی مسئلہ بن گیا ہے۔ ذیل میں اس اختلاف کو صاف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

صفی نے نظم اور نثر دونوں شکلوں میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ عزیز ان کے شاگرد تھے۔ صفی لکھنوی لکھتے ہیں:۔

> "نواب وصی علی خاں وصفی مرحوم کو میرزا محمد ہادی عزیز کی طرح پہلے نواب بنے صاحب مشاق سے تلمذ تھا پھر دونوں صاحب مجھ سے اصلاح لینے لگے"[3]

---

[1] زبانی مہذب لکھنوی

[2] بازار سخن ص ۱۳۳

[3] دیوانچی ص ۶۳

صفی کو فخر تھا کہ عزیز جیسا شاعر ان کا شاگرد ہے جس کا اظہار انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے :۔

فدائے زادۂ طبع عزیز نکتہ سنج خود ہمانا پیروی دارم سخن گوئے زبان انے
دلِ ما شاد چوں یعقوب چشم ما از و روشن عزیز ماست در مصر معانی ماہ کنعانے [۱]

پتہ نہیں استاد اور شاگرد میں آگے چل کر کس بات پر کشیدگی ہو گئی اور عزیز نے کون سا رُخ اختیار کیا کہ صفی نے ان کو وفا شعار شاگردوں کی فہرست سے الگ کر دیا۔ صفی کہتے ہیں ؎

"تھے اور بھی صفی مرے کتنے تلامذہ نکلے وفا شعار سب انہیں مگر عزیز" [۲]

عزیز بھی متعدد مقامات پر اعتراف کرتے ہیں کہ صفی کے شاگرد تھے اس سلسلہ میں راقم نے جناب شعلہ الہ آبادی سے ان کے دولتکدہ (رانی منڈی۔ الہ آباد) پر ملاقات کی۔ عزیز اور صفی دونوں سے انکے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ عزیز نے اپنے ایک شعر میں واضح کر دیا ہے کہ وہ صفی کے شاگرد تھے۔ عزیز کا شعر ہے :۔

"میں گلستانِ صفی کا ہوں اک ادنیٰ گلچیں اُس کا شاگرد ہوں جس کا نہیں استاد کوئی"

شعلہ صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ یہ شعر رسالہ "معیار" کے کسی پرچہ میں نکلا ہے۔ میری نظر سے معیار کے جو پرچے گذرے ان میں یہ شعر نہیں ملا۔ اس شعر کے علاوہ ایسے ثبوت موجود ہیں جن سے عزیز کا اعتراف ثابت ہوتا

---

[۱] "برق تجلی"، قصیدہ در مدح حضرت علی از عزیز لکھنوی جو بفرمائش گلشن فیض لکھنؤ (مطبع) سے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا۔

[۲] صحیفۃ الغزل ص ۵۹

ہے۔ مثلاً قصیدہ "برق تجلی" جو لوگوں کے اصرار سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔ یہ قصیدہ ۱۳۲۰ھ میں چھپا تھا یعنی اُس وقت عزیز کی عمر بیس سال کی تھی اس کتابچہ پر واضح الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ مصنف مولوی مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی تلمیذ رشید جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ اِس عُمر میں عزیز متفقہ طور پر صفی کے شاگرد تھے۔ جس کا اعتراف خود عزیز کو بھی تھا۔ ورنہ ان کی مرضی کے خلاف اُن کو صفی کا تلمیذِ رشید نہ لکھا جاتا۔

اس سلسلہ میں دوسرا ثبوت "معیار" کے رسالوں سے ملتا ہے۔ معیار جنوری ۱۹۰۸ء سے جون ۱۹۰۸ء تک کے چھ رسالوں میں سلسلہ وار عزیز کے نام کے آگے "تلمیذ جناب صفی لکھنوی" لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کی نشر و اشاعت کا انتظام عزیز ہی کے ذمہ رہتا تھا۔ عزیز کے مخلص دوست پروفیسر آغا اشہر لکھتے ہیں:۔

"دورِ معیار مرحوم بھی لکھنؤ کی اصلاحِ مذاقِ سخن کا پہلا سنگِ بنیاد تھا۔ چند حضرات مثلاً صفی، ثاقب، عزیز، محشر، آرزو لکھنؤ میں جدتِ سخن کے محرکِ اول ہیں۔ اس رسالہ کی خدمتِ ترتیب ہمیشہ عزیز مرحوم کے ذمہ رہی"[1]

آغا اشہر کا یہ بیان از روئے محبت یا عقیدت نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی ہے جس کی طرف خود عزیز کا بیان اشارہ کرتا ہے۔ عزیز رسالۂ معیار میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] رسالۂ ادیب دسمبر ۱۹۳۵ء

"نو سال سے انجمن دائرہ قائم ہے۔ یہ انجمن نہایت سلامت روی سے اپنے فرائضِ منصبی کو انجام دے رہی ہے۔ اسی انجمن کے تحت میں انجمن معیار اور رسالۂ معیار رہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب میرے مکان پر میر تقی میرؔ کا صد سالہ جشن ہوا تو بیادگاری جلسۂ ہذا اس کے دستور العمل میں ترمیم کی گئی اور بعض جدید ضوابط و قواعد معین کیے گئے، جو عنقریب شائع ہوں گے۔ ہمارا شیوہ نہیں کہ ہم اخباری دنیا میں قبل از وقت کوئی آواز بلند کریں[1]"

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ عزیزؔ رسالۂ معیار کی مجلسِ عاملہ کے ایک خاص رکن تھے۔ اب ان حقائق کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر عزیزؔ لکھنوی جناب صفیؔ کے شاگرد نہ ہوتے تو اپنے نام کے آگے "تلمیذ جناب صفیؔ لکھنوی" کے لکھنے سے نہ صرف عزیزؔ کا اقرار ظاہر ہوتا ہے بلکہ احساسِ فخر کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ اگر عزیزؔ کو صفیؔ کا شاگرد ہونے پر فخر نہ ہوتا تو ہرگز اپنے کو صفیؔ کا تلمیذ اپنی خواہش سے نہ لکھتے۔ جب تک یہ احساسِ فخر رہا برابر لکھتے رہے اور جب سے اس احساس میں کمی آئی لکھنا چھوڑ دیا۔ جولائی ۱۹۰۸ء سے اپنے نام کے آگے "تلمیذ جناب صفیؔ" لکھنا ترک کر دیا ورنہ شاید تلمذ کے بارے میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔

عزیزؔ اور صفیؔ کے ان اعتراضات کے علاوہ وہ لوگ جو عزیزؔ سے

---

[1] رسالۂ معیار بابت دسمبر ۱۹۰۸ء ص ۱۵

بہت قریب تھے عزیزؔ کو صفیؔ کا شاگرد کہتے تھے۔ مثلاً آغا اشہرؔ لکھنوی لکھتے ہیں:۔

"عزیزؔ مرحوم نے اپنے خاص عطیۂ فطرت کا احساس کیا اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ابتداء میں بنے صاحب مشتاقؔ مرحوم سے اصلاحِ سخن لی اُس کے بعد لسان القوم مولانا صفیؔ سے[1]"

ان تمام بیانات کی روشنی میں عزیزؔ کا صفیؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کرنا اظہر من الشمس ہے اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

---

[1] رسالہ ادب دسمبر ۱۹۳۵ء

عزیز لکھنوی کے تلامذہ

عزیز کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جس میں قصیدہ اور غزل گو، نظم، مثنوی اور مزاحیہ نگار، صحافی، نثار، ہندو مسلم، شیعہ سنی امیر غریب، معروف غیر معروف، چھوٹے اور بڑے شاعر سب شامل ہیں۔ جو تلامذہ معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ شبیر حسن جوش ملیح آبادی:۔ (افسوس کہ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو اسلام آباد پاکستان میں یہ آفتاب غروب ہو گیا)

یہ مشہور و معروف شاعر کس طرح عزیز کا شاگرد ہوا خود جوش سے سنیئے:۔

میرے باپ میر کو غالب پر ترجیح دیتے، ہلکی پھلکی زبان میں شعر کہتے اور داغ کے اس شعر پر عامل تھے سہ

کہتے ہیں اُسے زبانِ اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی جس میں جا بجا فارسی کی ترکیبیں تھیں اور ایک مصرعہ تھا۔

ہماری زندگی یعنی وفائے رازداں تک ہے

انھوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر ارشاد فرمایا "سبحان اللہ یعنی وفائے رازداں تک ہے۔ اس یعنی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ تم کچھ دن میں "شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا" تک آجاؤ گے۔ ناصاحب میں تمھیں اصلاح نہیں دوں گا اور تمھیں عزیزؔ صاحب کے سپرد کردوں گا۔ وہ بھی "یعنی وفائے رازداں" اور "شمار سبحہ" کے برتنے والوں میں ہیں۔ دونوں میں خوب نباہ ہوگا" یہ فرما کر انھوں نے عزیزؔ صاحب کو بلا کر مجھے ان کا شاگرد بنادیا اور یہ سلسلہ تلمذ پانچ چھ برس کے اندر ہی منقطع ہوگیا اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیزؔ بہت ہی اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے اور جہاں تک زبان کی صحت اور لہجہ کی نجابت کا تعلق ہے اُن کی ذات سے مجھ کو بہت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر یہ معلوم ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاحوں سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور اُبھر آتا ہے۔ لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا لیکن اس سے میرے اور اُن کے تعلقات میں کسی قسم کی تلخی راہ نہیں پا سکی۔ میں ہمیشہ اُن کے روبرو سر جھکاتا اور وہ ہمیشہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے"۔[1]

---

[1] یادوں کی برات ص۱۰۴، ص۱۱۶

۲۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی:۔

جوش لکھتے ہیں:۔

"حضرت عزیز لکھنوی کے قابل ناز شاگرد مجھ ہیچمداں کے استاد بھائی علم عروض اور فن شاعری کے مرکزی استاد۔ فارسی اور انگریزی کے زبردست نباض۔ قلزم انسانیت کے ستارۂ صنوبار، منبر انتقاد کے خطیب اعظم، مسندِ زباں کے قاضی القضاۃ اور مدینۂ تہذیبِ لکھنؤ کے طاقِ زریں کے ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے جن کے گل ہو جانے سے تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا اور ہر ذرہ کراہ کراہ کر فریاد کر رہا ہے کہ

"اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"۔[۱]

اثر کی شخصیت اور کلام محتاجِ تعارف نہیں۔ لہذا جو باتیں محض عزیز سے متعلق ہیں درج کی جاتی ہیں۔

تلمذ:۔ عزیز فرماتے ہیں:۔

"اس بات کے اظہار میں انکسار کی ضرورت نہیں کہ اثر مجھ سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ اس لئے میں ان کی زیادہ تعریف خود ستائی پر محمول کرتا ہوں"۔[۲]

تخلص بدلنا:۔ عزیز لکھنوی کی شاگردی میں آنے سے پہلے جعفر تخلص تھا۔ عزیز نے تخلص بدل کر اثر رکھا جس کا تذکرہ اثر ایک

---

[۱] یادوں کی برات ص ۴۱۷

[۲] اثرستان ص ۱۹

شعر بھی کرتے ہیں [1]

کس قدر ہیں ستم ظریف عزیز — کہ اثر نام کر دیا میرا [1]

عزیز کی شاگردی پر فخر:۔ اثر آخر عمر تک عزیز کی شاگردی پر فخر کرتے رہے جو ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ مثلاً اثر کہتے ہیں:۔

سن کے تیری یہ غزل خوش ہیں عزیز خوشنوا — عرض کر دے اے اثر سب فیض ہے استاذ کا

غزل کبھی اُسے اصلاح دے کے چمکایا — مشاعروں میں لیا ساتھ اور پڑھوایا

اُبھار ابھار کے آخر ہوا او کھلوایا — تمہارے فیضِ تلمذ سے نام اثر پایا

تمہاری یاد ہے باقی کلام باقی ہے — تمہارے نام سے اپنا بھی نام باقی ہے

وہ باغباں جو نہیں گلکدہ تو باقی ہے — اثر سے پوچھو کہ وہ غمزدہ تو باقی ہے [2]

۳۔ جگت موہن لال رواں اناوی[3]:۔

رواں کی ذات اور شاعری غیر معروف نہیں عزیز نے ان کا تفصیلی تعارف "روحِ رواں" کے مقدمہ میں کرا دیا ہے۔ یہاں پر صرف وہی باتیں درج کی جاتی ہیں جن کا تعلق عزیز سے ہے۔

تلمذ:۔ عزیز لکھتے ہیں

"مصنفِ "روحِ رواں" آج کل کے خود رو شعرا کی طرح اپنے کلام کو عیوب سے پاک نہیں سمجھتے اور اس فن کو مستقل فن جانتے ہیں۔ اس پختہ خیالی نے اُن کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ کبھی کبھی

---

[1] اثرستان ص ۱۵

[2] انجم کدہ ص ۱۴۰

[3] وفات ۱۹۳۴ء میں ہوئی، مسعود نے تاریخ کہی: "آہ اے منشی جگت موہن ہشاعرِ بے بدل فرشتہ صفت
سالِ رحلت کے واسطے مسعود + عزت و شان ملا مو خلعت (از عندلیب تواریخ)
۱۹۳۴ء

کسی سے مشورہ سخن بھی کر لیا کریں۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء سے انھوں نے مجھے اپنے حلقۂ احباب میں داخل کیا۔ اب تک وہ کبھی کبھی مشورۂ سخن کر لیتے ہیں۔[1]

رواں بھی عزیز کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ میں پہلے صرف رباعیات ہی شائع کرنا چاہتا تھا لیکن استادِ محترم لسان الہند جناب مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کے حکم کی تعمیل میں مجموعہ شائع کرتا ہوں۔ اگر اس تمام ہذیان میں ایک مصرع بھی کسی صاحبِ ذوق کو پسند آئے تو وہ جناب مولانا عزیز مدظلہ کے فیض و عنایات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔"[2]

۴۔ اعجاز حسین خاں اعجاز دریابادی[3] (الہ آباد)

ان کے مورثِ اعلیٰ سید محمد اعظم عہدِ عالمگیر میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور الہ آباد (یوپی) میں قلعہ کے منتظم بنائے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد بڑے بیٹے ارادت خاں اس عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ سلسلہ اعجاز کے دادا بڑے مراد خاں تک پہنچا۔ اسی زمانہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ان کا سارا تعلقہ اور رہائشی مکان ضبط کر لیا اور بعد میں راجہ بنارس کو دے دیا۔ جو اب بھی بلوا گھاٹ (الہ آباد) میں راجہ بنارس کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزی سرکار نے ان کے

---

[1] روحِ رواں ص۔

[2] ״ ״ ص۵

[3] راقم کے پاس موجود جناب اعجاز کی قلمی تحریر سے ماخوذ

خاندان کے لئے نو سو روپیہ سالانہ مقرر کر دیا۔ یہ رقم تمام افرادِ خاندان پر منقسم ہو کر اعجاز کو بہت قلیل صورت میں اب بھی مل رہی ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ کی کچہری بڑے گھر کے نام سے موسوم ہے اور اب یہ زنانہ امام باڑہ ہے۔ اس پر اٹھارہ سو روپیہ سالانہ وقف ہے اسی مکان میں اعجاز کی ولادت ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ پھر اس سلسلہ کو منقطع کر کے میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ کانگرسی ہونے کے جرم میں کئی بار ان کی جائداد قرق ہوئی۔ ان کے کانگرسی ساتھیوں میں پنڈت نہرو[1]، تصدق رسول شیروانی، عبدالرؤف الہ آبادی، منگلا پرشاد پرشوتم داس ٹنڈن، رائے امرناتھ اور سالک رام جیسوال وغیرہ تھے۔

ان کے تصانیف غیر مطبوعہ ہیں جن میں دیوانِ غزلیات، مجموعۂ قصائد قطعات، نظمیں، تاریخیہ قطعات، سہرے، سلام اور مسدس وغیرہ ہیں۔

ابتدا میں پروفیسر مہدی حسین صاحب ناصری سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ پھر ان کا رنگِ تغزل دیکھ کر ناصری نے ان کو عزیز کے سپرد کر دیا۔ عزیز نے امتحاناً ان کی پہلی غزل سنی تو کہا یہ خانقاہ کے قابل ہے مشاعرہ کے لائق نہیں۔ پھر اپنے ہی سامنے دوسری غزل کہنے کا حکم دیا۔ دوسری غزل کہی جس کو عزیز نے بہت پسند کیا اور اپنا شاگرد بنا لیا۔ اس غزل کے دو شعر دیکھئے

سُرخی یہ خونِ دل کی ہے آنسو کے تار میں　　یا توت یا پرو دئے ہیں موتی کے ہار میں
بیمارِ شامِ ہجر کی نبضیں اُبھر گئیں　　کس نے تمھارا نام لیا احتضار میں

آپ نے اپنی غزلوں میں وارداتِ قلب اور جذباتِ عشق کی آئینہ داری

---

[1] جواہر لال

میں ندرتِ ادا سے کام لیا ہے۔ اشعار میں آفاقی رنگ اور اجمالی شان ہے۔ جس کا اندازہ صاحبانِ نظر اشعارِ ذیل سے لگا سکتے ہیں۔[1]

اِک داغ مرے دل میں ہے اِک داغ جگر میں
دو شمعیں جلائی ہیں تری راہ گذر میں

کہتا رہتا ہوں قفس کی تیلیوں سے رازِ دل
کنجِ تنہائی میں کوئی رازداں ملتا نہیں

شمع و پروانہ جسے کہتے ہیں محفل والے
سوز اور ساز کے اس پردے میں ہم تم تو نہیں

اگر محنت کی ہوتی قدر دنیائے محبت میں
خدا معلوم شیریں بازوئے فرہاد کیا کرتے

شعر کی زینت ہے اب اعجازؔ حسنِ صوت بھی
زمزمہ پیرائی لازم ہے غزل خوانی کے ساتھ

گل و بلبل بھی اب بیگانۂ الفت ہیں گلشن میں
ہوا کیسی چلی یارب کہ دل سے دل نہیں ملتا

عشق نے حوصلہ افزائیاں کی ہیں جس کی
کارِ دشوار کو دنیا میں وہ آساں سمجھا

سوئے دنیا خُلد سے روتے ہوئے آدم چلے
یوں مرتب اس کتابِ غم کا دیباچہ ہوا

اپنے استاد عزیزؔ کے لئے فرماتے ہیں۔

اُٹھ گئے اعجازؔ دنیا سے عزیزؔ خوشنوا
رونقِ گلشن گئی اجڑا گلستاں رہ گیا

اعجازؔ یادگارِ جنابِ عزیزؔ ہوں
محفل میں شمعِ کشتہ کا مجھ کو دھواں سمجھے

۵۔ چودھری رحم علی الہاشمی[2]:۔

۱۸۹۸ء میں بمقام تھلوارہ ضلع بارہ بنکی پیدا ہوئے۔ خاندانی سلسلہ سید سالار مسعود غازی تک پہونچتا ہے۔ آپ کے اجداد خواجہ بہرام اور

---

1. جنابِ اعجازؔ کے پاس موجود بیاضوں کے دو قلمی نسخوں سے ماخوذ
2. یادیں از رحم علی الہاشمی "سوگوار یادیں" اور "نغماتِ الہاشمی" شعری مجموعے ہیں)
نمونۂ کلام: مست وہ مست کہ ہر گام پہ میخانہ بنے
جس طرف ہاتھ اٹھا دیں وہی پیمانہ بنے
ہم کو پامال ہی کرتی رہی دنیا لیکن
سیر دیکھا کئے ہم سبزۂ بیگانہ بنے

خواجہ نظام نے سیہہ اور سلیمان پور (ضلع بارہ بنکی) کو فاتح کی حیثیت سے آباد کیا۔ بادشاہ جہانگیر نے آپ کے اجداد کو ۱۶۱۶ء میں چودھری کا خطاب دیا۔ آپ دس ہی سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ طالب علمی کا زمانہ مفلسانہ بسر ہوا۔ انگریزی اور عربی سے بی، اے پاس کیا۔ انگریزی سے ایم اے پریویس کیا تھا کہ صحت نے جواب دے دیا۔ آپ نے دنیائے صحافت میں کافی کام کیا۔ ہمدم، انڈیپنڈنٹ، استقلال، ایک پیشہ انڈین ٹیلیگراف، انڈیپنڈنس، اسٹار، تریاق، مسلم یونیورسٹی گزٹ، پیام اور مسیج (MESSAGE) وغیرہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے انفارمیشن بیورو میں سینئر جرنلسٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ آرمی پریس میں اسسٹنٹ منیجر بھی ہوئے۔ صحافت کی وجہ سے آپ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے بہت قریب رہے۔ صحافت کے علاوہ انگریزی اور اردو ادب پر آپ کی تصنیفیں بھی ہیں جن کی تعداد بیس تک پہونچتی ہے۔ صحافتی اور ادبی کارناموں کی تفصیل کے لئے چودھری صاحب کی "یادیں" ملاحظہ فرمائیے۔ عزیز کے شعر ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی　　　اور مجھے آج تک خبر نہ ہوئی

سے اتنا متاثر ہوئے کہ اسی روز عزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

۶۔ جناب امیر حیدر صاحب حُب اور مسحور (نہار اجکمار آف محمود آباد)

آپ کی ولادت بتاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۱۸ء بمقام بہرولی، ضلع سیتاپور ہوئی۔ آپ کی تعلیم ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک مارٹینز کالج لکھنؤ اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوئی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء کو آپ کی شادی

بلہرہ (بارہ بنکی) کی راجکماری کے ساتھ ہوئی۔

آپ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر، شیعہ آل پارٹیز کانفرنس کے کنوینر، سیتاپور آئی ہاسپٹل کے چیرمین، ریلوے بورڈ کے ممبر، شیعہ سنٹرل بورڈ آف وقف کے صدر، بورڈ آف ڈائرکٹرس محمود آباد سوک اینڈ انڈسٹریل کارپوریشن کے وائس پریسیڈنٹ رہے اور فرائض منصبی بخوبی انجام دیئے۔[۱]

آپ ہمہ وقت علمی یا دینی خدمات میں مشغول رہتے ہیں آپ کے اخلاق اور خاکساری کا یہ عالم ہے کہ ایک غریب اور نادار سے بھی آپ اسی طرح ملتے ہیں جس طرح کسی صاحبِ جاہ و دولت سے۔ مجھے اکثر موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ناداروں کا پرتپاک استقبال دیکھ کر میری ذہنی تہذیب کو ایسے درس ملتے ہیں جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ یقیناً اعلیٰ ظرفی اسی کا نام ہے۔

آج کل آپ حضرت علیؑ کی مشہور تصنیف "نہج البلاغہ" کا ترجمہ براہِ راست عربی سے انگریزی میں کر رہے ہیں۔ اس وقت "الواعظ" اور مدرسۃ الواعظین کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ آپ نے بھی اپنے کلام پر عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لی، مرثیہ، قصیدہ، سلام، رباعی، قطعہ، غزل اور نظم وغیرہ پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے سلام

۱؎ بیاگرافکل انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ ۲۰ (انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ فار بیاگرافی۔ نیویارک)

کے دو شعر درج ذیل ہیں ؎

شور ہے ماہِ غمِ سبطِ پیمبر آیا ۔۔۔ کربلا آنکھوں میں پھرنے لگی دل بھر آیا
پھر گئی سب کی نگاہوں میں محبؔ کی صورت ۔۔۔ آج اس شان سے محبؔ بر سرِ منبر آیا

یہ غیر مطبوعہ سلام ہے۔ اس سلام پر ذیل کی عبارت درج ہیں۔

"یہ میرا پہلا سلام ہے جو ۱۳۵۲ھ میں کہا گیا اور اس پر جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی نے اصلاح دی۔"

ایک غزل کے دو شعر بھی بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں:-

غم ملے مجھ کو اک زمانے کے ۔۔۔ یہ نتیجے ہیں دل لگانے کے
آشیاں میں تھے کل قفس میں آج ۔۔۔ سب کرشمے ہیں آب و دانے کے

۷۔ باقر حسین رنگینؔ لکھنوی۔[۴]

باقر حسین ولد ذاکر حسین ۱۴ نومبر ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ رستم نگر لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ہائی اسکول (درجہ دہم) پاس کرنے کے بعد ۱۶ نومبر ۱۹۳۲ء سے سرکاری ملازمت میں آ گئے اور کنگس انگلش ہاسپٹل وکٹوریہ گنج لکھنؤ میں کمپاؤنڈر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ ملازمت کے زمانہ میں آپ بلرام پور ہاسپٹل۔ سول ہاسپٹل، موہن لال گنج ملیح آباد، بخشی کا تالاب، سنٹرل جیل، پولیس ہاسپٹل لکھنؤ، اجمیر، ہردوئی،

---

[۱] جناب محبؔ کے والد مہاراجہ آف محمود آباد (سیتاپور) کا تخلص محبؔ تھا
[۲] جناب محبؔ کے پاس ہے
[۳] ارمغانِ محبؔ ص ۴۰۳
[۴] زبانی باقر حسین رنگینؔ

اور حج میڈیکل پارٹی کے ساتھ حجاز اور سعودی عرب میں رہے راجیندر نگر ٹی۔بی کلینک سے ۱۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو سبکدوش ہوئے۔

آپ کا مزاج بچپن سے ظریفانہ تھا۔ سلسلۂ تعلیم بھی ظریفانہ رہا آپ نے کلاس سے زیادہ کالج پاس کیے ہیں۔ تعلیم تو دسویں جماعت تک ہی ہوئی۔ لیکن لکھنؤ میں مشکل ہی سے ایسا کالج ہوگا جس میں آپ نے داخلہ نہ لیا ہو۔ آپ ایک اچھے اسپورٹس مین (SPORTS MAN) تھے اس لئے ہر پرنسپل اپنے کالج کا دروازہ آپ کے لئے ہمیشہ کھلا رکھتا تھا۔

بیس سال کی عمر سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ نبّن صاحب راز لکھنوی کے یہاں مزاحیہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اس میں آپ ایک سامع کی حیثیت سے شامل ہوتے رہے بعد میں خود کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوگیا تخلص زٹمک تھا۔ مگر جب عزیزؔ نے اپنے حلقۂ تلامذہ میں داخل کیا تو تخلص بدل کر رنگینؔ کر دیا اور کہا کہ "ایک رنگینؔ اگر دہلی میں تھا تو ایک لکھنؤ میں بھی ہونا چاہیے"[1]

آپ جب شرفِ تلمذ کے لئے خدمتِ عزیزؔ میں حاضر ہوئے تو عزیزؔ نے حسبِ معمول شاعرانہ صلاحیت کو جانچنے کے لئے "لذتِ صحرا نوردی دورئ منزل میں ہے" پر فوراً مصرعہ لگانے کے لئے کہا۔ رنگینؔ نے برجستہ کہا ؎

پاؤں میں جن کے ہیں سینپر ہے یہ ان کا قول ہر لذتِ صحرا نوردی دورئ منزل میں ہے

عزیزؔ کو مصرعہ پسند آیا اور فرمایا "تم اسی ظریفانہ رنگ میں شعر کہا کرو اور مجھ سے اصلاح لے لیا کرو۔" آپ کی ہزل کے دو شعر بطور نمونہ درج

---

[1] باقر حسین رنگینؔ کی زبانی قولِ عزیزؔ۔

ذیل ہیں ؎

انھیں عادت ہے بیسہ ڈھونڈھنے کی ۔۔۔ جب ہی تو راہ میں نیچی نظر ہے

زمانہ کہتا ہے جس کو موذن ۔۔۔ ہماری رائے میں مرغِ سحر ہے

۸۔ لئیق الزماں۔ لئیق لکھنوی[1]

جنوری ۱۹۰۹ء میں بمقام لکھنؤ ولادت ہوئی۔ آپ کے عم محترم آغا رضا صاحب لاولد تھے۔ آپ کے والد نے آپ کو انھیں کی فرزندی میں دے دیا۔ سلسلۂ تعلیم ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء تک رہا پھر اپنے چچا کے ساتھ مشرقی افریقہ چلے گئے وہاں آپ کا تقرر ریلوے میں بہ عہدہ گارڈ ہو گیا۔ مگر جب آپ اپنی شادی کی غرض سے ہندوستان آئے تو پھر افریقہ نہیں جانے دیا گیا اور یہیں ریلوے کے محکمہ میں اسٹور کیپر مقرر ہو گئے۔

آپ کے والد بھی شاعر تھے اور شفیق تخلص تھا۔ آپ پہلے مشاعروں میں صرف شریک ہوتے رہے پھر خود غزل کہنے لگے۔ اپنے تلمذ کی بابت آپ لکھتے ہیں:۔

"والد مرحوم نے جناب عزیز جو کہ میرے خالو بھی ہوتے ہیں، تلمذ حاصل کرا دیا۔ ان کی حیات تک اصلاح لیتا رہا، چونکہ فکرِ معاش سے وقت بہت کم ملتا ہے اس لیے اس شوق کو قائم نہ رکھ سکا۔"

نمونۂ کلام:۔

بیساختہ ہنسنے میں نکل آئے جو آنسو ۔۔۔ آغاز میں انجام کی صورت نظر آئی

---

[1] لئیق صاحب نے مجھے ایک تحریر مرحمت فرمائی۔ آپ کے حالات اسی تحریر اور زبانی گفتگو سے اخذ کیے گئے ہیں۔

ہر سانس میں دنیا کی حقیقت نظر آئی　　مرنا بھی تھا مشکل مجھے جینا بھی تھا مشکل

تمام عمر کا بس یہ مآل ہوتا ہے　　تمار ہی ہیں کسی کی رکی ہوئی سانسیں

۹۔ حکیم سید علی آشفتہ[۱]

آپ خاندانِ اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب مولوی دلدار علی غفرانمآب تک پہونچتا ہے۔ آپ کا معیارِ علم و فضل بہت بلند تھا۔ حکیم اجمل خاں کے تلمیذ تھے۔ فرنگی محل[۲] کے پل پر آپ کا مطب تھا۔ یہاں دن بھر شاعر اور ادیب جمع رہتے تھے۔ سیاست سے بھی دلچسپی تھی جس کے سلسلہ میں جیل بھی گئے۔ لکھنؤ میں سراج اور منظر وغیرہ نے ایک ینگ پارٹی بنائی تھی آپ اُس کے سربراہ بھی تھے۔ آخر میں آپ حیدرآباد دکن چلے گئے اور نظام کے طبیہ کالج میں پروفیسر ہو گئے لکھنؤ ہو یا حیدرآباد آپ جہاں بھی رہے بڑی شان و شوکت، آن بان اور بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ رہے۔

نمونۂ کلام[۳]:-

دحشت میں بھی خیالِ رسوم و قیود تھا　　اللہ رے کوہ کن تری بیدار مغزیاں

---

[۱] بزبانی سید نواب افسر صاحب ماخر لکھنوی بتاریخ ۲۳ جون ۱۹۸۰ء اور ہما اردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۷۳ء میں شوکت تھانوی کا مضمون "لکھنؤ کا ایک دور"، مرتومہ ۱۹۵۵ء۔

[۲] لکھنؤ کا ایک مشہور محلہ۔

[۳] جلۂ معیار ۱۹۰۸ء ماہ فروری ص۱، ماہ اپریل ص۱۹، ماہ جون ص۱۶

آتی ہے درس گاہِ محبت سے یہ صدا — موج جہاں میں حرفِ وفا بے وجود تھا
طور و موسیٰ سے عیاں نیرنگِ جذبِ حسن ہے — ایک تو بے خود ہوا اور ایک سراپا جل گیا
اب انتہا یہ ہے کہ سراپا میں درد ہوں — وہ ابتدائے عشق تھی جب دل میں درد تھا

۱۰۔ سید محمد رضا بیدل الہ آبادی

آپ الہ آباد کے محلہ دائرہ شاہ اجمل کی مشہور ہستی ڈاکٹر مصطفےٰ صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور خود سینیٹری انسپکٹر تھے۔ قصیدے، غزلیات اور قطعات کثرت سے ہیں مگر سارا کلام غیر مطبوعہ ہے۔ والد کا نام سید محمد کاظم تھا۔ بیدل کی وفات ۳۰ نومبر ۱۹۵۹ء[۱] کو ہوئی۔

نمونۂ کلام[۲]:-

مرنے والو روتے کیوں ہو موت خدا کی رحمت ہے — قیدِ عناصر سے تم چھوٹے زیست کا سر سے وبال گیا
صدقے تمہارے کیوں تم آئے زلفیں بکھیرے تربت پر — جاؤ سنوارو گیسو اپنے دل سے ہمارے ملال گیا
ڈھونڈھ رہے ہو کس کو بیدل ملنے کے نہیں ہیں تم کو عزیز — آیا نہ واپس جا کر کوئی جو بھی اہلِ کمال گیا

۱۱۔ مرزا محمد عباس علی خاں جگر لکھنوی[۳]

آپ کی ولادت ۱۵ شوال ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۰ء) میں ہوئی آپ کے مورثِ اعلیٰ مرزا محمد نعیم خاں وسط ایشیا سے سلطان المعظم شاہ عرف بہادر شاہ کے عہد حکومت میں دہلی آئے۔ آپ کے جد امجد مرزا غلام محمد خاں نادر شاہ کے حملوں

---

[۱] رقعۂ عرفان عباسی جو راقم کے پاس ہے۔ عرفان عباسی کو یہ تاریخ شعلہ الہ آبادی کے خط سے معلوم ہوئی۔
[۲] قلمی نسخہ جو راقم کے پاس محفوظ ہے
[۳] رسالۂ معیار بابت جنوری ۱۹۱۱ء ص ۱۰ سے ص ۲۰ تک۔

کے بعد دہلی کی ابتر حالت دیکھ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار کی طرف چل دیئے۔ فیض آباد نہیں پہونچنے پائے تھے کہ قصبہ ردولی میں گذر ہوا۔ مرزا صاحب کو یہاں کے رہنے والوں کا طرز زندگی کچھ ایسا پسند آیا کہ یہیں سکونت اختیار کرلی۔ کچھ زمین حاصل کرکے زمیندار بھی بن گئے۔ جگر لکھنوی کے جد مرزا اسالار بخش اور والد مرزا آغا علی خاں کی ولادت ردولی میں ہوئی۔
مرزا آغا علی خاں اپنے عنفوانِ شباب میں بہ عہد سلطان نصیر الدین حیدر تن تنہا لکھنؤ چلے آئے اور ذاتی کدوکاوش سے دربار شاہی تک پہونچ گئے۔ بادشاہ نے آپ کو سلطانپور کا ناظم مقرر کیا۔ آپ کا انتظام اتنا اچھا تھا کہ ناظم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد ہی سنہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ پیش آیا۔ آپ ایسے خوش تدبیر اور مآل اندیش تھے کہ جو اعزاز اور اعتبار آپ کو شاہی دربار میں حاصل تھا وہی انگریزی دربار میں بھی حاصل ہوا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں آپ کی وفات ہوئی اور مرزا عباس علی خاں جگر جانشین ہوئے۔
جگر نے عربی، فارسی اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی جب ہندوستانیوں پر سول سروس کے امتحان کا دروازہ کھولا گیا تو آپ اس میں شریک ہوئے پہلی ہی کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کرکے فیض آباد کے اسسٹنٹ کمشنر ہوئے۔ ہندوستان کے یہ پہلے شخص تھے جو اس عہدۂ جلیل پر فائز ہوئے۔ ضلع ہردوئی اور بہرائچ میں ڈپٹی کمشنر اور سیتاپور میں ڈسٹرکٹ سشن جج رہے ۱۲ر مئی سنہ ۱۹۱۰ء کو سفر آخر کیا۔
آپ بڑے علم دوست، ادب نواز اور ادیب پرور تھے۔ عزیز سب سے پہلے آپ ہی سے وابستہ ہوئے۔ مرزا صاحب عزیز سے عمر میں بہت بڑے تھے مگر عزیز کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے اور ان سے مشورۂ

سخن[1] بھی کرتے تھے۔

نمونۂ کلام :-

عام حالت میں بسر کی زندگی تو نے تو کیا | کچھ تو ایسا کر کہ عالم بھر میں افسانہ رہے
اب رنگ زمانہ نے وہ بدلا ہے کہ جس میں | سائل کے لئے دستِ تو انگر نہ اٹھے گا
نہ مسرت ہمیں اچھی نہ ملال اچھا ہے | آپ راضی رہیں جس طرح ہی حال اچھا ہے

۱۲۔ شیخ تجمل حسین بیمار[2] :-

آپ جید عالم دین شیخ فدا حسین بسوانی کے صاحبزادے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی بادشاہ حسین صاحب عربی، فارسی، اردو کے علاوہ سنسکرت ہندی، جرمن اور انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے اور انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ بادشاہ حسین صاحب کو دائی محمود آباد مہاراجہ علی محمد صاحب کی بہن منسوب تھیں۔ بیمار کو ایسے ذی علم باپ اور بھائی کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ آپ کے والد عزیز لکھنوی کے معلم بھی تھے۔

نمونۂ کلام[3] :-

جس مسیحا سے کہ امید مدادا تھی، ہمیں | قہر ہے قہر وہی جان کا خواہاں نکلا
قتل کے بعد جو یاد آئیں وفائیں میری | ہائے کس طرح وہ مقتل سے پریشاں نکلا
کہتے ہیں میرے ذکر پہ اب بھی کبھی کبھی | یادش بخیر اپنے زمانہ میں فرد تھا

---

[1] دیباچہ گلکدہ ص۲
[2] مہاراج کمار آف محمود آباد جناب امیر حیدر صاحب کی زبانی، بتاریخ ۳۱ اگست ۱۹۸۰ء
[3] جلد معیار ۱۹۱۰ء ماہ مئی ص۲۳، ماہ جون ص۱۸، جنوری ضمیمہ ص۲

چارہ گر یاس سے میرے یہ کہہ کے آخر اٹھ گیا / اب ہے مشکل کارگر ہونا کسی تدبیر کا

۱۳۔ مرزا صادق حسین خنداں لکھنوی بھ١

آپ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے آپ کے والد نواب صاحب بھی شاعر تھے اور بندہ کاظم صاحب جاوید لکھنوی کے شاگرد تھے آپ ۲۵ سال تک روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں جرنلسٹ رہے بہت خوش اسلوبی سے زندگی بسر کی۔ آپ کا لڑکا بھی شاعر ہے جس کا نام سرکار عالم اور تخلص کوکب ہے۔

آپ کے تصانیف میں ایک کتاب جذبۂ تولید پر ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کے جذبۂ تولید کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک اور کتاب لکھنؤ کی عزاداری پر لکھا ہے۔ ایک مرثیہ شہید کربلا جناب حُر کے حال میں کہا ہے جس کو امامیہ مشن نے شائع کیا ہے، نوحے اور سلام کے مجموعے، فغان اہلِ بیت، حسینی پرچم اور افسانۂ بیکسی کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ نوحہ، سلام اور مرثیہ کے علاوہ آپ نے رباعی، قصیدہ، مثنوی، غزل اور نظم وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عزیزؔ لکھنوی سے ڈیڑھ سال تک صنائع و بدائع اور عروض کی تعلیم حاصل کی، غزلوں پر صرف چھ ماہ تک ہی اصلاح لے پائے تھے کہ عزیزؔ کی وفات ہو گئی۔

نمونۂ کلام:۔

اسیری میں اگر ذوقِ تصور مہرباں ہوتا / چمن کے تنکے تنکے پر خیالِ آشیاں ہوتا

---

١ زبانی جناب خنداں صاحب

طبیعت آشنائے دردِ پیہم ہوتی جاتی ہے مری وارفتگی لذت کشِ غم ہوتی جاتی ہے

۱۴۔ شیام موہن لال جگر بریلوی:۔

ولادت یکم جنوری ۱۸۹۰ء وفات پانچ مارچ ۱۹۷۶ء۔ والد رائے کنہیا لال دل اچھے شاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی، اردو اور فارسی کی کئی کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے انگریزی اور فلسفہ میں بی، اے کی سند حاصل کی ۱۹۱۷ء میں ایک مقامی مشن اسکول میں ٹیچر ہوئے، ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء سے بحیثیت تحصیلدار کام شروع کیا، چھبیس سال کے بعد اسی جگہ سے قبل از وقت پنشن لے لی۔ پھر ایک انٹر کالج میں اردو فارسی پڑھانے لگے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھتے رہے ۱۹۶۰ء تک پندرہ سولہ کتابیں لکھ چکے تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں۔

تصانیفِ نظم:۔ (۱) پپیہا اور پی کہاں (۲) رنگ و بو (۳) کالیستھ درپن (۴) مثنوی پیامِ ساوتری (۵) انتخابِ غزلیات (۶) رس (مجموعۂ رباعیات)

تصانیفِ نثر:۔ ۱۔ یادِ رفتگاں، ۲۔ صحتِ زبان، ۳۔ حدیثِ خودی ۴۔ جدید تغزل

تلمذ: ڈاکٹر لطیف حسین لکھتے ہیں:۔

"جگر صاحب کو عزیز لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، یہ امر گویا جگر صاحب کی عظمتِ فن پر مستزاد ہے[۲]"

---

[۱] "رس" (مجموعۂ رباعیات جگر) اور تذکرہ شعرائے اتر پردیش حصہ اول ص ۱۰۳ از عرفان عباسی

[۲] "رس" از جگر بریلوی پر ڈاکٹر لطیف حسین کا مقدمہ ص ح

نمونۂ کلام:۔

دل کو لذت شناسِ غم کرلیں | موت ہم کو اگر نہیں آتی
ہے امینِ وقارِ عجز و نیاز | وہ تمنا جو بر نہیں آتی
ہوگیا آخر جگر مصروفِ تعمیرِ خودی | دل کے ہر ذرہ میں اک جنت کا ساماں دیکھ کر
دل کی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے | اپنے ہی جلووں کا دیوانہ خود انساں ہو جائے
نہ غم کا غم نہ خوشی کی کوئی خوشی مجھ کو | کہ ایک بات ہے اب موت زندگی مجھ کو
یہاں تو ایک نیا درد روز بڑھتا ہے | کہاں تک اُن سے تڑپنے کا ماجرا کہیے

۱۵۔ عبدالحمید حمید لکھنوی[1]:۔

ولادت ۱۸۸۵ء اور وفات ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ آپ محبِ رسول[2] اور مقبول نعت گو تھے۔ نعتیہ قصائد کے مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں سب سے زیادہ مقبول "گلبانگ حرم" ہے، حمید صاحب نے کوچۂ شعر و سخن میں غزل گو کی حیثیت سے قدم رکھا تھا اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کو شاعرِ حرم کا خطاب دیا گیا۔ آپ کا مکان حِنا بلڈنگ چوک لکھنؤ سے متصل ہے[2]

نمونۂ کلام[2]:۔

پھر وہی بھولا ہوا یاد آگیا قصہ مجھے | زندگی پر موت کا پھر ہوگیا دھوکا مجھے
آگئی وہ فصلِ گل وہ کھل گئی زنجیرِ پا | خانۂ زنداں نظر آنے لگا صحرا مجھے

---

[1] ضمیمہ قومی آواز (روزنامہ لکھنؤ) مورخہ ۲۵ جون ۱۹۷۸ء میں عرفان عباسی کا مضمون۔

[2] رسالۂ معیار بابت ماہ جولائی ۱۹۳۰ء ص ۱۴

دل مرا دیران جب ہوگیا ہے اسے تمہید — باغ عالم میں نظر آتا ہے سناٹا مجھے

۱۶ - محمد یٰسین تسکین :-[1]

ولادت جنوری ۱۸۹۹ء بمقام سوروں ضلع ایٹہ ہوئی۔ والد کا نام سخاوت حسین تھا۔ انٹر میں فیل ہونے کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں سب انسپکٹر پولیس مقرر ہوئے۔ ترقی کر کے کورٹ انسپکٹر ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں ریٹائر ہوئے۔ قدیم تہذیب کے دلدادہ، وضعدار اور وسیع النظر تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ بچپن ہی سے تھا۔ ۱۹۲۳ء میں عزیز کے شاگرد ہوئے۔ اُن کا کلام زبان و بیان کی نفاست و لطافت، تخیل کی رفعت، مناظر قدرت کی عکاسی، حسنِ الفاظ اور پختگیٔ فن کی خوبیوں سے مالامال ہے۔ پنشن لے کر ۱۹۵۳ء سے میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شروع میں نظمیں کہتے تھے پھر غزل کہنے لگے۔ جملہ اصنافِ سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ کلام ملک کے موقر اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہا۔ ان کا مجموعۂ کلام "گلگونہ" چھپتے ہی دنیائے ادب میں دھوم مچ گئی۔ "مکاتیب جگر"، "صحائف اسعد" اور "مکتوباتِ عزیز" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء یونین پرنٹنگ پریس دہلی) کے مرتب آپ ہی تھے۔ ادبی خدمت کرتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۷۱ء کو آگرہ میڈیکل کالج میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی مطبوعہ تصنیفوں میں "سرمایۂ تسکین حصہ اول اور دوم"، "متاعِ تسکین" اور "گلگونہ" ہیں۔

نمونۂ کلام :-

خونِ دل رنگِ تغزل میں کیا ہے شامل — مٹ گیا ہوں تو یہ اندازِ بیاں آیا ہے

---

[1] حقیقیہ قومی آواز لکھنؤ ۳۱ اگست ۱۹۸۱ء اور تذکرہ شعرائے اترپردیش حصہ اول ص۹ سے ص۹۶

یہ آخر کیا تماشہ ہو رہا ہے — کوئی ہنستا ہے کوئی رو رہا ہے
مشکل تو ہے یہ راہ مگر دور نہیں ہے — ملتی نہیں بے جان دیے منزلِ جاناں
جو دل کو ٹوٹتے دیکھا تو مسکرا نہ سکے — ستم کا لطفِ ستم آزما اٹھا نہ سکے

۱۷۔ گوپی ناتھ شریواستو امنؔ لکھنوی:۔

لکھنؤ کے محلہ غوث نگر میں ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی مہادیو پرشاد المتخلص بہ عاصی لکھنؤ میونسپلٹی میں ہیڈ کلرک تھے۔ یہ اردو، ہندی اور فارسی تینوں ہی زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ امنؔ نے ۱۹۱۶ء میں امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا۔ عزیزؔ لکھنوی وہیں اردو ٹیچر تھے۔ ابتدائی کلام پر عزیزؔ سے اصلاح لی[1] پھر آتشؔ کے شاگرد بیج ناتھ فگار لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا۔ لکھنؤ میونسپلٹی میں ملازمت کی، پھر میرٹھ اور غازی آباد میں وکالت شروع کر دی، کانگریس کی تحریک میں ۱۹۲۰ء سے حصہ لینا شروع کیا اور قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بہت عزت کرتے تھے بعدِ آزادی دلی میں وزارت کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ آپ کی ادبی خدمات پر اردو اکاڈمی یوپی نے آپ کو پانچ ہزار روپیہ کا انعام بھی دیا ہے۔

غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مربع، مخمس، مسدس، مثنوی، گیت اور نظم پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ کلام میں ایک خاص قسم کا درد ہے۔ یہ قوم و وطن کا درد ہے جو آپ کے اشعار میں بہت نمایاں رہتا ہے۔ آپ کے تصانیف

---

[1] دیباچہ کاروانِ منزل ص ۹ سے ص ۱۶ تک

میں سے "کاروانِ منزل" میری نظر سے گذری۔ یہ آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔

نمونۂ کلام:۔

برہمن کعبہ میں ہو شیخ ہو بت خانہ میں — کوئی ایسا غلط انداز اشارا ہو جائے
یا تو انداز ہی دنیا کا بدل دے یا رب — یا وہ دل دے کہ یہ انداز گوارا ہو جائے
ہونے لگی ہے کرگس و بوم و زغن کی قدر — صحن چمن میں اب نہیں اہلِ چمن کی قدر
اے امن آبگینہ فروشی کے دور میں — درِ عدن کی قدر نہ لعل یمن کی قدر

۱۸۔ سید علی جواد زیدی زیدی[1]

آپ کی ولادت ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ آپ کے والد سید علی امجاد زیدی فارسی، عربی کے ماہر اور اردو کے شاعر تھے۔ آپ کا تعلق خاندان سادات سے ہے۔ آپ نے شعر و ادب کی آغوش میں پرورش پائی۔ آپ نے ۱۹۳۵ء میں کالون ہائی اسکول محمود آباد (سیتاپور) سے ہائی اسکول ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے انٹر اور ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی، اے کیا، پھر ایل، ایل، بی پاس کر کے اعظم گڑھ اور غازی پور میں وکالت شروع کی، مگر جلد ہی چھوڑ دی۔ آپ نے ملک کی سیاست میں بھی حصہ لیا اور آزادی ہند کی تحریک میں جیل بھی گئے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد آپ یوپی کے محکمۂ اطلاعات میں پبلیکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے پھر اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر مقرر ہوئے، پھر حکومت ہند کی وزارت میں انفارمیشن آفیسر بھی ہوئے۔ ریجنل

---

[1] خود علی جواد زیدی کی زبانی اور "خبرنامہ"، لکھنؤ اگست ۱۹۸۰ء ص ۳ سے ص ۸ تک

انفارمیشن آفیسر ہو کر کشمیر گئے، کشمیر کے وزیر اعلیٰ[1] کے خصوصی سکریٹری بھی رہے پھر ڈپٹی پرنسپل آفیسر ہو کر دہلی چلے گئے۔ گجرال اردو کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ آل انڈیا ریڈیو کے جوائنٹ ڈائرکٹر بھی ہوئے۔ اسی سلسلے میں ایران بھی بھیجے گئے اور تین سال کے بعد وہیں سے آپ سبکدوش (retire) ہو گئے۔

آپ کے ادبی مشاغل ناقابلِ فراموش ہیں۔ "آزاد" "زمانہ" "حقیقت" "سرفراز" "نیا دور" "شیرازہ" اور انگریزی ہفتہ وار "مون لائٹ" وغیرہ میں آپ نے نمایاں فرائض انجام دیئے۔ آپ کی تالیفوں اور تصنیفوں کی مجموعی تعداد تینتیس[33] تک پہونچ چکی ہے۔ ان کے علاوہ ستر یا اسّی مضامین ایسے ہیں جو کتابی شکل میں ابھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔

نمونۂ کلام[2]:-

تری منزل ہے آزادی کی منزل ۔۔۔ تمناؤں کی آبادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہیں ۔۔۔ غلامی کی سلاخیں توڑنا ہیں
وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا ۔۔۔ مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا ۔۔۔ مسافر راستہ میں رک نہ جانا

۱۹۔ ہوش بلگرامی[3]:-

---

[1] بخشی غلام محمد

[2] اردو میں قومی شاعری کے سو سال ص ۳۱۷

[3] آندھرا پردیش اپریل ۱۹۷۶ء ص ۳ سے ص ۱۲

سید ناظر الحسن ہوشؔ ولد سید اقبال حسین ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ سادات بلگرام ضلع ہردوئی کی ایک فرد تھے۔ سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تربیت مکمل کی۔ رامپور آئے اور بخشی فوج کے عہدے پر مامور ہوئے۔ پھر حیدر آباد آئے اور معتمد فوج کے منصب پر فائز ہوئے۔ نواب ہوشیار جنگ کا خطاب ملا۔ حیدر آباد سے ایک ادبی رسالہ "ذخیرہ" نکالتے تھے آپ کا انتقال ۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء کو ہوا۔[1]

تصانیف :- مثنوی "طوفانِ محبت"، "بدیہہ گوئی"، "عروسِ ادب"، "سرودِ غم"، "ہماری بت پرستیاں" اور "مشاہدات" وغیرہ آپ کے ادبی کارنامے ہیں۔

نمونۂ کلام :-[2] (محبت کے لئے لکھتے ہیں)

عجب اس کی فطرت کا انداز ہے ۔۔۔ کہیں سوز ہے اور کہیں ساز ہے
کسی دل میں غم ہے کسی میں نشاط ۔۔۔ کہیں کار فرما کہیں بے بساط
تبسم کہیں ہے کہیں زہر خند ۔۔۔ کہیں وجہ درد اور کہیں دردمند
کہیں بن گئی خود شہیدِ وفا ۔۔۔ کہیں اس کو دنیا پڑا خوں بہا
نرالے ہیں اس کے بلند اور پست ۔۔۔ کہیں بندہ در کہیں خود پرست

۲۰۔ حکیم محمد طاہر۔ طاہرؔ :-[3]

حکیم محمد طاہر عرف بنّے صاحب نام اور تخلص طاہرؔ تھا۔ آپ کے

---

[1] نقوش لاہور شخصیات نمبر ط ۱۳۰۱ سے صـ ۱۳۰۲
[2] طوفانِ محبت
[3] ماہنامہ حسنِ ادب، لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۶ء صـ ۵۴

والد کا نام حکیم علی محمد تھا۔ طاہر کی عمر بیس ہی سال کے قریب رہی ہوگی جب سنہ ۱۳۲۹ھ میں انتقال ہوگیا۔ قبر غفراں مآب کے امام باڑے میں ہے۔

نمونۂ کلام[1]:۔

بزمِ جہاں میں جب نہ کسی کا وجود تھا
جلوہ کسی کا آئینہ دارِ نمود تھا

وہ جام دے رہا تھا مجھے اپنے ہاتھ سے
لبریز خوں سے ساغرِ قلبِ حسود تھا

ہر نوا اسیرِ عشق پہ تقسیم ہو گیا
جو جانکنی کے وقت مرے دل میں درد تھا

یہ کہکے میری قبر پہ دی محنتوں کی داد
طاہر بلا کشانِ محبت میں فرد تھا

۲۱۔ علی محمد اجلال لکھنوی[2]:۔

لکھنؤ کے محلہ منصور نگر میں آپ کا آبائی مکان ہے۔ محلہ کٹرہ ابو تراب خاں میں بھی آپ کا ایک مکان ہے اور اسی میں آپ کے اہل و عیال رہ رہے ہیں۔ آپ عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے حیدر آباد میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ فانی بدایونی بھی اسی مدرسہ میں معلم تھے۔ اسی تعلق سے آپ نے "تجلیاتِ معانی، فی شرحِ رباعیاتِ فانی" بھی لکھی۔ آپ مجلسیں بھی پڑھتے تھے، عرصۂ دراز تک افریقہ میں واعظ کی حیثیت سے رہے۔ آپ کے صاحبزادے سید محمد حسین یونین بینک آف انڈیا میں برانچ منیجر ہیں۔ اجلال لکھنوی کا انتقال[3] ۱۲ر اگست سنہ ۱۹۷۰ء کو ہوا۔

نمونۂ کلام:۔

---

[1] جلد معیار لکھنؤ سنہ ۱۹۰۸ء جلد ۲ نمبر ۲ ص ۳ اور معیار بابت جون سنہ ۱۹۰۸ء ص ۱۷

[2] زبانی برادر زادہ اجلال لکھنوی

[3] سرفراز لکھنؤ مورخہ ۲۵ر اگست سنہ ۱۹۷۰ء

زندگی کے نام ہیں شادی و غم دونوں مگر ‏ اک ترے دل کے لئے ہے اک مرے دل کے لئے

پھینکتے ہو میکدے سے کیوں شکستہ جام کو ‏ اس کو رہنے دو کسی ٹوٹے ہوئے دل کے لئے

جانیوالے طور پر گر ساتھ موسیٰ ہیں تو کیا ‏ موت ہے ناواقفِ آدابِ محفل کے لئے

چند پروانوں کی لاشیں شمعِ کشتہ کے قریب ‏ یہ بہت ہے عبرتِ اربابِ محفل کے لئے[1]

۲۳۔ ذاکر حسین ذاکرؔ لکھنوی :۔

لکھنؤ کے محلہ مولوی گنج میں سکونت تھی، پہلے فصاحت کے شاگرد تھے پھر عزیزؔ سے مشورۂ سخن کیا، تقریباً پچپن سال کی عمر پائی۔ ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ کلام :۔

عاشقِ گیسو کی اور الجھن بڑھی فرقت کی شب ‏ شمع کی لَو کا دھواں جس وقت بل کھا کر اٹھا[2]

جانتا ہے کچھ وہی پست و بلندِ راہِ عشق ‏ جو مجھ ایسا ناتواں اٹھکر گرا گر کر اٹھا

---

[1] رسالہ احسن ادب لکھنؤ، جنوری ۱۹۲۷ء۔ ص ۵۹

[2] کر، قافیہ اور اٹھا، ردیف ہے۔

۲۳۔ نواب بنّے صاحب تقی لکھنوی[1]:۔

نواب بنّے صاحب تقی لکھنوی کے چند شعر نظر سے گذرے۔ اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذاق پاکیزہ تھا اور مضمون نکالنے کی طرف توجہ زیادہ تھی، رسالۂ معیار کی کمیٹی کے ممبروں میں تھے۔

نمونۂ کلام:۔

خوں بہاتا ہے جو دعوے سے کسی دلگیر کا — وہ اٹھے ہیں آج فیصلہ چوم کر شمشیر کا
مشقِ نظارہ نے اتنا جذب تو پیدا کیا — صفحۂ دل پر ہے نقشہ آپ کی تصویر کا
دیکھنے والوں کی نظروں کو کیا ہے مضطرب — رنگ اتنا شوخ ہے ظالم تری تصویر کا

شام ہونا غمِ فرقت کا سحر ہو جانا — یوں مری عمرِ دو روزہ کا بسر ہو جانا
روح کر دیتا ہے تحلیل یہ وہ صدمہ ہے — دلِ ناشاد کا ناکام اثر ہو جانا
آج بیمارِ محبت کی بری حالت ہے — ہو مناسب تو کسی وقت ادھر ہو جانا
تیرا آنا ہے مرے واسطے امیدِ حیات — تیرا جانا مرے مرنے کی خبر ہو جانا
ناتوانی غمِ فرقت میں بڑھی ہے اتنی — میری کروٹ کا بدلنا ہے سحر ہو جانا
آنے والی ہے قیامت یہ خبر دیتا ہے — آپ کا گورِ غریباں سے گذر ہو جانا

۲۴۔ مرزا احمد رضا ظفر لکھنوی[2]:۔

لالہ سری رام لکھتے ہیں کہ مرزا احمد رضا لکھنوی تلمیذ مولوی مرزا احمد ہادی لکھنوی لیاقت اور طبیعت دار شخص تھے شعر صاف کہتے تھے۔

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد دوم صفحہ ۱۱۶

[2] 〃 〃 صفحہ ۲۳۴

نمونۂ کلام:-

نہ پوچھ حالتِ بیمارِ شامِ ہجر نہ پوچھ — تمام رات فقط سانس کا شمار رہا
وہ آئے تھے مری تربت پہ فاتحہ پڑھنے — خرامِ ناز سے محشر سرِ مزار رہا
شریک کوئی برے وقت کا نہیں طغراؔ — شبِ فراق میں دل بھی نہ غمگسار رہا

سونے والے چونکتے ہیں سُن کے آہ — گو انھیں خوابِ جوانی کیوں نہ ہو
غیر ہاتھوں میں لگائیں جو حنا — پھر ہمارا خون پانی کیوں نہ ہو

۲۵- منشی شیر سنگھ شمیم گوردی[1]:-

آپ موضع گوری ڈاکخانہ گورسہائے گنج ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ بیس خاندان کے اعلیٰ ٹھاکر تھے۔ سنہ ۱۸۹۰ء کے آس پاس آپ کی ولادت ہوئی۔ آبائی پیشہ تیغ زنی اور نبرد آزمائی تھا۔ بعد میں ذریعہ معاش زمینداری رہی۔ شعر گوئی کے علاوہ نثر نگاری کا بھی شوق تھا۔

نمونۂ کلام:-

مجنوں صفت شمیم جو دیوانے بن گئے — ہندوستاں میں ہند کے ویرانے بن گئے
ساقی کے لطفِ عام سے رندوں کے واسطے — دنیا کے گوشے گوشے میں میخانے بن گئے
ویران رکھیے یا انھیں معمور کیجیے — سب کے دلوں میں آپ کے کاشانے بن گئے
ہمدردیوں کو ان کی بنایا شریکِ جاں — ہشیار اپنے کام میں دیوانے بن گئے

۲۶- سید محمد نقوی سید سرسوی[2]:-

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۵۵

[2] خزینۂ سخن ص ۲۵ مرتبہ منصور سبزواری مطبوعہ سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ سن طباعت سنہ ۱۳۶۲ھ

آپ کی ولادت ۱۸۹۳ء میں قصبہ سرسی تحصیل سنبھل ضلع مراد آباد کے مشہور سادات خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد منشی سید علی حسن مرحوم معروف زمیندار تھے۔ سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد حیدر آباد دکن میں سب رجسٹرار کی حیثیت سے دولت آصفیہ سے وابستہ ہو گئے۔ وہاں وظیفہ دار ہو کر سرسی واپس آئے اور ادبی خدمات میں مشغول ہو گئے۔ آپ کو فن عروض پر دستگاہ حاصل ہے۔ عروض پر کئی مستند کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ قصیدہ گوئی ان کی محبوب صنف ہے، جو عزیز لکھنوی سے شرف تلمذ کا نتیجہ ہے۔ قصیدہ گوئی کے بلند مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے عربی منطق ہیئت، ریاضی اور طب میں غیر معمولی دستگاہ حاصل کی۔

نمونۂ کلام:۔

شئونِ زمان و مکاں اور بھی ہیں ۔۔۔ حقیقت کے نام و نشاں اور بھی ہیں
اسالیبِ حسنِ بیاں اور بھی ہیں ۔۔۔ جحیم اور بھی ہیں جناں اور بھی ہیں
مرے ذوقِ سجدہ کو اللہ رکھے ۔۔۔ گدائے نمود آستاں اور بھی ہیں
میں الجھا رہوں دیر و کعبہ میں کب تک ۔۔۔ مرے آگے سنگِ گراں اور بھی ہیں
اسیرِ جنونِ تعین ہوں ورنہ ۔۔۔ فضاؤں کی پہنائیاں اور بھی ہیں
سلامت رہیں حسن و الفت کی راہیں ۔۔۔ تمھیں سر جھکے آستاں اور بھی ہیں
اٹھے جس سے سیدؔ و اقبالؔ و غالبؔ ۔۔۔ اسی خاک میں آسماں اور بھی ہیں

۲۷۔ شبیر احمد صاحب شبیرؔ[۱]:۔

---

[۱] خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۸۶ مرتبہ لالہ سری رام ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۶ء

خوش فکر اور ذکی الطبع شاعر تھے ان کے مفصل حالات ابھی دسترس میں نہیں ہیں۔ "خمخانۂ جاوید" سے تلمذ کی تصدیق ہوتی ہے۔ کلام بھی اسی تذکرے سے ماخوذ ہے۔

نمونۂ کلام :-

ہو گیا ہوں اس قدر محو جمال روئے دوست
مجھ کو اپنے پیرہن سے آرہی ہے بوئے دوست

حوصلہ خنجر کا شوق اپنا مرا ارماں نکال
اے مرے مشکل کشا اے قوت بازوئے دوست

مشکلوں پر رو لیے اس غمزدہ مایوس کے
چھوٹتے جو ایک آہ سرد بھر کے گوئے دوست

آکے دشمن نے خطائیں بخشوائیں ساحر سے جذب
ایسی مایوسی سے میں نے آج دیکھا سوئے دوست

ان تلامذہ کے علاوہ کچھ اور شاگرد ہیں جن کا نمونۂ کلام اور عزیزؔ سے تلمذ کا ثبوت "معیار"، لکھنؤ کے ماہناموں میں ملتا ہے لیکن ان کے حالات نہیں معلوم ہو سکے لہٰذا ان کے تخلص پیش کیے جاتے ہیں: قاسمؔ لکھنوی بنجوؔ بنارسی، تہورؔ بارہ بنکوی، رشیدؔ لکھنوی، کیفیؔ لکھنوی اور نشاطؔ لکھنوی۔

شرفِ تلمذ بخشنے کا طریقہ[1]

عزیز کے پاس جب پہلے پہل کوئی شاعر اپنے کلام پر اصلاح لینے اور شرف تلمذ حاصل کرنے کی غرض سے آتا تھا تو عزیز اُس کی افتادِ طبع اور معیارِ شاعری کو پرکھنے کے لئے اُسے کوئی مصرعہ دیتے تھے اور اس پر گرہ لگانے یا پوری غزل کہنے کا حکم دیتے تھے۔ اس کی مثال اعجاز اور رنگین کا تذکرہ کرتے وقت پیش کی گئی ہے مگر یہ امتحان ہر شاعر کے لئے ضروری نہیں تھا۔ مثلاً اثر اور رواں کے لئے یہ طریقہ نہیں اپنایا۔

عزیز کے "اصولِ اصلاح" کچھ اساتذہ اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح دینے وقت اپنی آسانی کے لئے پورا شعر بدل دیتے ہیں اور استاد کی غزل بنام شاگرد بزمِ سخن میں آتی ہے۔ اصلاح کا

---

[1] زبانی جناب اعجاز وریا بادی (الہ آباد) اور جناب رنگین لکھنوی

[2] مشاطۂ سخن معروف بہ شمعِ سخنوری صـ ۱۳

یہ طریقہ استاد کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ عزیز اس طریقہ کو پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے اصلاح کے کچھ اصول وضع کیے اور انھیں "اصولِ اصلاح" کی سرخی کے تحت قلم بند کر دیا جو اس طرح ہیں :۔

۱۔ "شاگرد کو پہلے ضروریاتِ شعر پر مطلع کرنا چاہیئے۔

۲۔ شعر میں صرف الفاظ کا تغیر چاہیئے۔ خیال بدلنے کی ضرورت نہیں۔ اگر شعر معنوی حیثیت سے خراب ہے تو قلمزد کرنا چاہیئے۔

۳۔ پورے شعر یا مصرعہ کی ترمیم منظور رہے تو شاگرد کو ہدایت کی جائے کہ وہ خود کوشش کرے۔ اِس طرح اُس کی قوتِ نظم میں ترقی ہوگی۔

۴۔ جب شعر میں کوئی ترمیم کی جائے تو اُس کا سبب سمجھا دینا چاہیئے تاکہ آئندہ وہ اس غلطی سے بچے۔

۵۔ خود شعر کہہ کر شاگرد کو نہ دینا چاہیئے۔ اُس سے اس کی ہمت فکرِ سخن میں کم ہوتی ہے اور استاد پر بھروسہ رہتا ہے۔

۶۔ غزل، قصیدہ، مثنوی ان سب کی زبانیں مختلف ہیں۔ اصلاح میں یہ بات مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔"

— مرزا محمد ہادی عزیز
یکم فروری ۱۹۱۰ء لکھنؤ [1]

اصلاح کے نمونے :۔ شیخ تجمل حسین بیمار نے اپنا قصیدہ بغرض اصلاح بذریعہ ڈاک عزیز کو بھیجا۔ عزیز نے بعدِ اصلاح یہ لکھ کر قصیدہ کو واپس کیا۔

---

[1] مشاطۂ سخن معروف بہ شمعِ سخنوری ص ۱۳

"عزیزی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ دعا!
قصیدہ بعد اصلاح مرسل ہے۔ اہل و عیال سب لکھنؤ میں ہیں۔ چند روز کے لئے محمود آباد آیا ہوں۔ خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر ہوں۔ جناب قبلہ[1] کی خدمت میں تسلیم قبول ہو۔[2]

عزیز

کلامِ بیمار معہ اصلاحِ عزیز:۔
خط کشیدہ الفاظ پر ہی عزیز کی اصلاح درج کی جاتی ہے، تاکہ نقل مطابقِ اصل ہو:۔

تموجِ خون

تلاطم قلب میں ہے درد سا معلوم ہوتا ہے
مجھے انداز پھر دِل کا بُرا معلوم ہوتا ہے

سامان کچھ عشرت فزا

پریشاں گو نظر آتی ہیں ہم کو حضرتِ فضہ
مگر اس گھر میں شادی کا سما معلوم ہوتا ہے

قدم ہیں

کھڑا ہے دوش پر مہرِ نبوت پاؤں کے نیچے
ہمیں یہ بھی کوئی نفسِ خدا معلوم ہوتا ہے

---

[1] بیمار کے والد مولوی فدا حسین لبوانی جن سے ادبیات کی تعلیم عزیز نے حاصل کی تھی۔
[2] نامۂ عزیز بنام شیخ تجمل حسین بیمار معہ قصیدۂ اصلاح شدہ جو راقم کے پاس محفوظ ہے۔

یہ ہے وہ نیرِ اسلام

یہی وہ نقطۂ اول ہے جس کے پرتوِ رخ سے جہاں کا ذرہ ذرہ پُر ضیا معلوم ہوتا ہے

ایک دوسرے قصیدے میں ایک شعر کی اصلاح صرف الفاظ کی نشست بدل کر :-

مطلق اب

پریشاں دیکھ کر حضرت کو مخدومہ یہ کہتی ہیں حفاظت میں کروں گی آپ اب مطلق نہ گھبرائیں

بیمار کی ایک غزل کے تین شعروں پر اصلاح :-

سچ ہے عیشِ زندگی

کیا مزا ناصح بھلا دیوانہ بن جانے میں ہے دل نہ جب پہلو میں ہو کیا لطف ہوش آنے میں ہے

آزادیاں

عشق کی سرگرمیاں پابندیوں سے بڑھ گئیں اے دلِ صبر آزما اب زیست مر جانے میں ہے

ہے کوئی نہ

اس کے ہاں کے حکم کی تعمیل ہے اپنی خوشی زندگی میں عذر نے انکار مر جانے میں ہے

بیمار کی ایک نظم بعدِ اصلاح مندرجہ ذیل خط کے ساتھ واپس کیا۔ خط میں صاف اشارہ کر دیا ہے کہ نظم میں، شتر گربہ تھا جو کلام کا عیب ہے۔ اصلاح سے اس عیب کو دور کر دیا گیا ہے۔ نامۂ عزیز :-[1]

" عزیزی

نظم میں کہیں خطاب "آپ" تھا کہیں "تم" کہیں "تو" یہ عیب سب شعروں سے نکال دیا اور نظم مسلسل ہو گئی۔ امید ہے کہ سب خیریت ہو۔ مولانا کی خدمت میں سلام قبول ہو۔"

---

[1] نامۂ عزیز معہ نظمِ اصلاح شدہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔

اس نظم میں لفظی تغیر کے علاوہ مکمل مصرعہ اور شعر بدل کر بھی اصلاح دی گئی ہے اور ایک شعر کو "قافیہ غلط ہے" لکھ کر کاٹ بھی دیا گیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موقع محل اور شعری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عزیز نے اپنے وضع کئے ہوئے اصولِ اصلاح کی زنجیریں توڑی بھی ہیں۔ اشعار معہ اصلاح ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

خون سے سیراب کر کے
نرغوں سے بچا بچا جس نے سنبھالا ہے تمھیں

جس نے پالا ہے تمھیں سیراب کر کے خون سے
جس نے برسوں آہیں کھینچی ہیں دلِ محزون سے

کامیابی ہے تمھاری جس کی امیدِ حیات
چشمۂ آبِ بقا سے کم نہیں ہے جس کی ذات

ہے امیدِ زیست جس کی کامیابی آپ کی
موت ہے بدبخت کی ناکامیابی آپ کی

لے کے گودی میں گذاریں جس نے راتیں عمر کی
کھینچی ہیں آہ و نالہ جس کی سانسیں عمر کی

قافیہ غلط ہے، راتیں اور سانسیں قافیہ نہیں ہیں یہ ایطائے جلی ہے جو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے قافیہ کے لیے ضروری ہے کہ بشکل واحد بھی قافیہ رہے، صیغۂ واحد میں رات، اور سانس ہم قافیہ نہیں ہیں اس لئے شعر کاٹ کر عزیز نے لکھ دیا "قافیہ غلط ہے"۔

عزیز کی اصلاح صنفِ شاعری کے مطابق ہوتی تھی جسے انھوں نے "اصولِ اصلاح" کی سرخی کے تحت آخر میں واضح کر دیا ہے مثلاً باقر صاحب رنگین غزل گو شاعر تھے۔ ان کے کلام پر اسی طرح کی اصلاح کا نمونہ دیکھیے

کلام رنگین معہ اصلاحِ عزیز[1]

بے خطا ہاں
کیا تبا ہیں آج کیا ہم مہرباں دیکھا کیے
اُن کے کوچہ میں کرایہ کا مکاں دیکھا کیے

لے لیا بوسہ کسی شیریں دہن کا خواب میں
پھر کھا کے منھ نہیں دھویا یونہی ہم سو گئے
جب کھلیں آنکھیں تو منھ پر مکھیاں دیکھا کیے

---

[1] زبانی باقر صاحب رنگین۔

یہاں پر صرف لفظ بدل کر اصلاح دینے سے کام نہیں چل سکتا تھا مجبوراً پورا مصرعہ بدلنا پڑا۔

عزیزؔ کی اصلاحوں سے صرف کلام کا عیب ہی نہیں دور ہوتا تھا بلکہ اس میں جان پڑ جاتی تھی۔ اصلاح کا مقصد بھی یہی ہے۔ جتنا ماہر استاد ہوتا ہے اُس کی اصلاح اُتنی ہی جاندار ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اصلاحوں سے ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عزیزؔ کس مرتبہ کے استاد تھے۔

عزیز اپنے علم و فضل اور ملکۂ شعر و ادب کی وجہ سے متعدد اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ غزل اور قصیدہ میں آپ نے نمایاں حیثیت حاصل کی نظموں میں بھی ایک معیار قائم رکھا۔ ان اصناف پر آپ کی خاص توجہ رہی، ان پر الگ الگ مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ رباعی، قطعہ، سلام، مرثیہ اور فرد پر بھی طبع آزمائی کی مگر صرف تفریحاً آپ کے کلام کا جائزہ حسبِ ذیل ہے۔

آپ کی غزلوں کے دو مجموعے ہیں: "گلکدہ" آپ کی حیات میں ہی چھپ گیا تھا۔ یہ دیوان اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی اڈیشن چھاپے گئے دوسرا دیوان "انجم کدہ" ہے جو آپ کی وفات کے اٹھائیس سال بعد شائع ہوا۔

آپ کی غزلوں میں نہ زلف و شانہ کی تعریف ہے نہ لباسِ محبوب کے

وضع قطع اور خارجی محاسن کا ذکر نہ مبالغہ آرائی کی افراط ہے نہ رعایت لفظی کی بھرمار۔ یہ چیزیں لکھنؤ کی شاعری کو بدنام کر رہی تھیں۔ آپ نے اپنے استاد صفی کے ساتھ لکھنؤ کے دامنِ شاعری سے اِن دھبوں کو صاف کرتے ہوئے ایک نئے تغزل کی ابتدا کی، آپ نے وارداتِ قلب کے بیان میں دہلوی رنگ اختیار کیا۔ میر کا سوز و گداز اور غالب کی رعنائیِ فکر آپ کے کلام میں عام طور سے موجود ہے۔ زبان میں آپ نے خالص لکھنوی رنگ اختیار کیا۔ کلام کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ علم کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ آپ نے غزل کے کچھ فرسودہ اصولوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور اس میں نئے موضوعات داخل کئے۔ قدیم ہو یا جدید، لکھنؤ ہو یا دہلی آپ نے کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی جہاں کی جو باتیں آپ کو پسند آئیں اختیار کیں اور کچھ نئی باتوں کا اضافہ کیا۔ اس طرح تقلید کے باوجود آپ نے اپنی انفرادیت قائم رکھی، احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

> "لکھنؤ کے جدید تغزل کا سب سے بہتر مرقع حضرت عزیز کا مجموعہ غزلیات "گلکدہ" کہا جا سکتا ہے جس میں دہلی کی جذبات نگاری، روحانیت تصوف، سوز و اثر کے پہلو بہ پہلو لکھنؤ کی زبان کی شیرینی، محاورات کی دلآویزی، الفاظ کی دلکش ترتیب، فصاحت اور روزمرہ کی عام لطافتیں موجود ہیں۔ فلسفہ کے مشکل مسائل غزل کے دلسوز نغموں میں گھلا دیئے۔ اخلاق کے تلخ مسئلے حسن و عشق کی رنگینیوں میں چھپا کر پیش کئے۔ اُن کے کلام میں وہ تڑپ موجود ہے جو شاعر کے بے چین دل کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری اکتسابی چیز نہیں مگر اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ علم کے ساتھ ساتھ فطری قوتوں پر بھی جلا ہوتی جاتی ہے۔ ادائے مطلب کے لئے علم کی

سخت ضرورت ہے۔ ان کی شاعری کی بنیاد علم کی مضبوط چٹان پر رکھی ہوئی ہے، اساتذۂ فن کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام میں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں، جو ایک کہنہ مشق شاعر کے یہاں ملتی ہیں[1]۔"

آپ کی غزلوں میں سوز و گداز اور رنج و غم کا رنگ بہت تیز ہے جب گلکدہ آپ ہی کی زندگی میں چھپ کر نکلا اور ناقدین کے تبصرے بھی مختلف اخبار و جرائد میں چھپنے لگے تو اُس وقت عام اعتراض بھی یہی تھا کہ اشعار میں موت اور بے ثباتی کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ کلام میں مرثیت پیدا ہو گئی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے عزیز کہتے ہیں:۔

"میرے نزدیک سوز و گداز اور درد و غم غزل کے عناصر ہیں۔ خوش دلی کی منزل عاشق سے دور ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ رنگ میرے کلام میں بہت تیز ہے۔ مگر کیا کروں۔ رنگِ طبیعت سے مجبور ہوں۔ عبرت مجھ پر غالب اور نشاطِ طبع مفقود ہے۔ اہلِ دل کبھی کبھی گورِ غریباں کی بھی سیر کر لیتے ہیں۔ آپ بھی گلکدہ کو اسی نظر سے دیکھیں[2]۔"

عزیز نے اس اعتراف سے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دے دیا واضح نقول میں حق بات کہدی۔ تخلیق کو شاعر کے نظریہ کے مطابق ہونا ہی چاہیئے۔ یہ اختلاف مذاق وہ نظریہ قابلِ تحسین بھی ہو سکتا ہے اور قابلِ مذمت بھی۔ شعر کے متعلق اپنے نظریات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عزیز کہتے ہیں:۔

"شاعری مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے اس میں صرف اپنے ہی جذبات کو

---

[1] نیشل ۱۹۳۵ء (الہ آباد یونیورسٹی میگزین) جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۲

[2] گلکدہ صفحہ ۲۱

ادا کرنا چاہیئے اور شعر صرف اپنے لئے کہنا چاہیئے۔"[1]

عزیز نے یہ وضاحت اس لئے کر دی کہ کسی شاعر کے کلام کی صحیح قدر و قیمت اُس وقت تک نہیں ٹھہرائی جا سکتی جب تک خود شاعر کا شعر کے متعلق نقطۂ نظر واضح نہ ہو۔ ناقد کے لئے لازم ہے کہ وہ شاعر کے جذبات و خیالات اور عصری رجحانات کے ساتھ ساتھ شاعر کے نظریاتِ شعر کا علم بھی حاصل کرے اسی طرف عزیز اشارہ کرتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں:

پھر سنوں شوق سے میں تیری نصیحت ناصح دیکھ ہر کام مرا میری نظر سے پہلے[2]

اگر عزیز کی نظر سے اُن کی غزلوں کو دیکھا جائے تو مذکورہ بالا اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ عزیز اُس جگہ کھڑے تھے جہاں سے کاروانِ رقص و سرود گذر کر دور جا چکا تھا مگر سازِ عیش و عشرت کی ہلکی ہلکی آوازیں کان میں آ رہی تھیں جو دھیرے دھیرے کم ہو کر مفقود ہو رہی تھیں سر پر رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مصائب و آلام کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ بحرِ حوادث کی موجیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ معاصرین عزیز بھی اس رنگِ زمانہ سے متاثر تھے۔ عزیز اپنی طبیعت سے مجبور تھے۔ ورنہ وہ بھی اصغر کی طرح رنج و غم جھیلنے کا ایک توانا انداز پیش کرتے۔ مثلاً اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اصغر کا نظریہ عزیز کے نظریہ سے مختلف تھا۔ عزیز کے نزدیک درد و غم اور سوز و گداز غزل کے عناصر ہیں جبکہ اصغر غزل میں رنگینیِ جوشِ تخیل کے قائل

---

[1] گلکدہ ص ۵

[2] ایضاً ص ۹

ہیں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیے — مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

ناقدین کا یہ بھی خیال صحیح ہے کہ عزیزؔ کے یہاں مرض، نزع، موت نوحہ، ماتم، ساکنانِ خاک کی بستی، مدفن اور گورِ غریباں وغیرہ کا ذکر بہت کثرت سے ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا حق ہے کہ عزیزؔ پر عبرت غالب تھی، لہٰذا جن باتوں سے انسان کو عبرت حاصل ہوتی ہے انھیں کا ذکر عزیزؔ نے اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ عزیزؔ نے اہلِ دل سے خواہش بھی یہی کی ہے کہ وہ گلکدہ کو اسی نظر سے دیکھیں جس سے وہ گورِ غریباں کی سیر کرتے ہیں۔

انسان کو عبرت حاصل کرنے کے لئے گورِ غریباں سے بہتر کوئی جگہ نہیں ملتی۔ عزیزؔ ہی نہیں بلکہ مغرب و مشرق کے متعدد فنکاروں کو جب بھی عبرت کے درس دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھوں نے موت، مرقد مقبرہ، لحد، قبر اور گورِ غریباں سے استفادہ کیا۔ مثلاً۔

میرؔ:۔ مقبروں میں دیکھتے اپنی انھیں آنکھوں سے ہیں — یہ برادر، یہ پدر، یہ خویش، یہ فرزند ہیں

ظفرؔ:۔ منعم اس دولتِ دنیا پہ نہ کر دیکھ غرور — سیکڑوں گور میں کیا کیا نہیں بہرام دبے

ذوقؔ:۔ کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے — خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

ناسخؔ:۔ گذرنا گا، جب میرا ہوا شہرِ خموشاں میں — عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا

اکبرؔ:۔ سرِ خاکِ شہنشاہانِ عالم کہتی ہے عبرت — قدم رکھنے بچا کر آئے جو شہرِ خموشاں میں

پئے تسلیم سر جھکتا تھا سب کا جن کے ایواں میں — انھیں کی خاک اب پامال ہے گورِ غریباں میں

اقبالؔ:۔ نے گیا تھا طرفِ گورِ غریباں دلِ زار — کیا کہیں تم سے جو کچھ واں کا تماشا دیکھا

کل تلک محفلِ عشرت میں تھے جو صدر نشیں — قبر میں آج انھیں بے کس و تنہا دیکھا

اسی طرح مغربی شعرا نے بھی موت اور مرقد کے ذریعہ عبرت کے سبق دیئے ہیں۔ مثلاً جان ڈائر (JOHN DYER) کی نظم "روم کے کھنڈر (RUINS OF ROME) یا ٹامس گرے (THOMAS GRAY) کا مرثیہ جو قبرستان میں لکھا گیا (ELEGY WRITTEN IN A COUNTRY CHURCH YARD) دیکھئے اس کا ترجمہ بھی نظم طبا طبائی نے "گور غریباں" کے نام سے کیا ہے۔ جیمس مانٹگمیری[1] (JAMES MONTGOMERY) اور شیلے[2] (SHELLEY) کی نظموں میں بھی یہ مثالیں موجود ہیں۔ شیکسپیئر[3] (SHAKESPEARE) اور ملٹن[4] (MILTON) وغیرہ کے یہاں بھی یہ نمونے نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

عزیز نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے ہیں اور دامنِ غزل کو وسعت دی ہے۔ عزیز کے اس طرح کے اشعار بہت زیادہ ہیں۔ ان میں معنی آفرینی اور رعنائی فکر بھی ہے۔ مثلاً ؎

عالمِ گورِ غریباں اک نظر کا راز ہے	کچھ نہ پوچھ ان سونے والوں کی خموشی کا سبب
ہوا دل کو کھلاؤں ذرا گورِ غریباں کی	ابھی آمادۂ عبرت نہیں یہ محوِ خودداری

---

[1] نظم "THE GRAVE" دیکھئے

[2] نظمیں "TO WILLIUM SHELLEY", "YE HASTEN THE GRAVE", "DEATH" وغیرہ دیکھئے۔

[3] ڈرامے "HAMLET", "ALL'S WELL THAT ENDS WELL" "TITUS ANDRONICUS" دیکھئے

[4] "PARADISE LOST", "SAMSON AGONISTES" وغیرہ دیکھئے۔

اُن کے دماغ اُن کے خیالوں کو دیکھئے ہو سرسری نہ گورِ غریباں پہ اک نظر

عزیز کے کلام میں علمی و فکری عنصر بہت ہے لیکن یہاں پہ دوسرا اعتراض بھی ہوتا ہے کہ بعض اشعار بعید الفہم ہو گئے ہیں۔[۱] عزیز نے اس اعتراض کو بھی یکسر غلط قرار نہیں دیا۔ عزیز کہتے ہیں:-

"شعر کا بعید الفہم ہو جانا بہت ممکن ہے۔ بسا اوقات اظہارِ معنی کے لئے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ شاعر چونکہ اس مضمون کا خلاق ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی نظر محویت میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ مضمون ادا ہو گیا مگر دوسروں کے واسطے وہ الفاظ ادائے مطلب میں کفایت نہیں کرتے میں نے اکثر ایسے الفاظ "گلکدہ" سے خارج کر دیے اور بعض بعض مقامات پر ترمیم و اصلاح کر دی۔ اب بھی ممکن ہے کہ بعض اشعار لوگوں کو کھٹکیں مگر وہاں اختلافِ مذاق کی منزل ہے[۲]"

شعر کے بعید الفہم ہونے کی ایک وجہ تو اختلافِ مذاق ہے اور دوسری وجہ قاری کا محدود علم اور تجربہ بھی ہے اختلافِ مذاق کا ثبوت عزیز ہی کے ایک شعر سے مل جاتا ہے۔ عزیز کہتے ہیں:-

میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے

یگانہ چنگیزی کو یہ شعر بہت ذلیل معلوم ہوا[۳] اس پر انھوں نے لاحول پڑھا۔ اکبر کو یہ شعر بہت پسند آیا اور بہت پاکیزہ، شاعرانہ تکلف

۱؎ گلکدہ ص ۲۱

۲؎ گلکدہ ص ۲۲

۳؎ دیباچہ "شہرت کاذبہ موسوم بہ خرافاتِ عزیز"

کے ساتھ تو عارفانہ خصوصی ہو[1]۔ قیامت کے لفظ کو اکبر الہ آبادی جانے روتا بل داد اور یگانہ نے فحش کہا ہے۔ یہ ہے اختلافِ مذاق کی منزل، جو لفظ یگانہ کو فحشیات کی طرف لے گیا اکبر کو وہی الٰہیات کی طرف۔

جن اشعار میں انھیں جذبات و واردات کو پیش کیا جاتا ہے۔ جو عامتہ الورود ہوتے ہیں جلد سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن جب شاعر کسی خاص تجربہ کی تصویر پیش کرتا ہے تو وہ بعید الفہیم ہو جاتے ہیں۔ عزیز کا ایک شعر ہے ؎

سرہانے بیٹھنے والے ترا بیمار غافل ہے
یہ سامنے رسم غمخواری کے سرہانے سے کیا حاصل

قصبہ زید پور ضلع بارہ بنکی کی ایک مشہور ہستی سید دلدار حسین نے بہت زمانہ ہوا راقم کو بتلایا کہ یہ شعر ان کی سمجھ میں کبھی نہ آیا لیکن ایک حادثہ ان کے سامنے ایسا گذرا کہ برجستہ ان کی زبان پر یہ شعر آگیا وہ حادثہ یوں ہے کہ بمبئی میں اُن کے ایک دوست تھے اُن کا کروڑوں روپیے کا کاروبار تھا، دو بھائی تھے دونوں کروڑ پتی تھے۔ دوسرے بھائی کو خدا نے کوئی اولاد نہیں دی۔ باپ چچا دونوں اکلوتے بیٹے پر قربان رہتے تھے جب بیٹا جوان ہوا تو اس کی شادی کی گئی اور دولت کا کھل کر مظاہرہ کیا گیا۔ سید دلدار حسین صاحب اس شادی میں شرکت کرکے پلٹے ہی تھے کہ انھیں دوست کا تار ملا۔ یہ فوراً پھر بمبئی روانہ ہو گئے۔ گھر پہونچ کر دیکھا کہ وہی لڑکا جس کی چند دن پہلے شادی ہوئی تھی، موت و حیات کی کشمکش میں تھا اور بیہوش تھا۔ باپ چچا ماں اور بہنیں اس کے پلنگ کے گرد رو پیٹ کر جان دے دینے پر تیار اور اس کی دلہن رسم شرم و حیا کے تحت ایک کونے میں سسک سسک کر رو رہی تھی۔ بس جو شعر ان کی سمجھ میں کبھی نہ آیا وہ آپ سے آپ ان کے لبوں پر آگیا

---

[1] مکاتیبِ اکبر خط نمبر ،

اس واقعہ کی روشنی میں شعر کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اور شعر بہت لطف دیتا ہے۔

عزیز شوکتِ لفظی سے زیادہ معنی آفرینی کے قائل تھے۔ عزیز کے بزرگ معاصرین امیر، داغ، جلال اور تسلیم شوکت لفظی کو طرۂ دستارِ فضیلت سمجھتے تھے۔ اس پامال راستہ پر عزیز نہیں چلے اور معنی آفرینی اپنائی کہیں کہیں معنویت کا رنگ اتنا گہرا ہو گیا کہ شعر بعید الفہم ہونے کی منزل تک پہونچ گیا۔ یہی الزام غالب کے متعدد اشعار پر بھی ہے۔ عزیز کے مشکل اشعار کے کچھ نمونے حسبِ ذیل ہیں:۔

اک تجلی بڑھ گئی اور حسن کا پردہ کیا
عشق نے رسوا نگہ میں جب اثر پیدا کیا

حسن نے اک ذرۂ ناچیز کو دینا کیا
اعتقادِ عشق پُر معنی بڑھانے کے لئے

بُت اک نگاہ پڑتے ہی پتھر کے ہو گئے
حیرت فروش جلوۂ دلبر کے ہو گئے

"گلکدہ" پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ کلام پر فارسیت کا غلبہ ہے اور بعض ترکیبیں غور طلب ہیں۔ اچھا ہوا کہ یہ ساری نکتہ چینی عزیز کی زندگی ہی میں ہو گئی اور عزیز نے صفائی بھی پیش کر دی۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے عزیز کہتے ہیں:۔

"میرے نزدیک فارسی کی ایک چھوٹی سی ترکیب جس وسیع موضوع کو ادا کر دیتی ہے، اردو کی طویل عبارت بھی اس کے لیے ناکافی ہے اور میں اپنے مذاق سے مجبور رہ کر اس مضمون کا خون نہیں کر سکتا۔ سلاست و روانی کا خود دلدادہ ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس قدر متعصب بھی نہیں کہ کبھی کوئی ترکیب عطفی و اضافی آنے ہی نہ پائے۔ ترکیبوں کے استعمال میں اکثر قدما کی پیروی کرتا ہوں۔ مثلاً گلکدہ کے چند

الفاظ میں عزیز کے اشعار پیش کرتا ہوں جن پر اعتراض تھا کہ کلام قدما میں موجود نہیں۔

"شیوائی"۔ قاآنی

شیوۂ شعر تو قاآنی سحریست حلال — زانکہ گفتن نتواں شعر بدیں شیوائی

نالۂ آتش نشیں۔ بیدل:۔

چہ امکانست دل از حلقۂ داغت برآوردن — سپند بزم ما را نالۂ آتش نشیں باشد

تحریک بمعنی ترغیب" اصفہانی:۔

فراموشم ز یادش بخت آنم گو کہ بہر گوئی — دہد تحریک از از من وا از من دہد یادش

عرفی:۔ فلک بمدح تو دوشینہ کرد تحریکم — چناں کہ نطق بنزدیک داستاں آمد

دور دور۔ قبول:۔

در نظر آں نرگس مستانہ است — دور دور ساغر و پیمانہ است[1]"

اس طرح عزیز نے اعتراف کرتے ہوئے ان کے جواب دے دیئے۔ اعتراض اپنی جگہ ہے کس شاعر کا کلام بے عیب ہے اور کس پر نکتہ چینی نہیں کی گئی چشم حقیقت سے اگر دیکھا جائے تو عزیز کی غزلوں میں بڑی رعنائی موجود ہے۔ مثلاً ان کا مشہور شعر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

اقبال جیسا مفکر اور بالغ نظر شاعر اس شعر کو پڑھ کر کہہ اٹھتا ہے:۔

"سبحان اللہ یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں[2]"

---

[1] گلکدہ ص۲۳

[2] ایضاً ص۱۲

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:-

"...... عزیز لکھنوی نے تو حد ہی کردی۔ بعض مخصوص حالات یا ذہنی کیفیات کے زیر اثر کسی کی انگڑائی لاکھ ولولہ انگیز سہی لیکن عام طور سے انگڑائی یا جماہی کوئی حسین یا خوش آہنگ منظر نہیں پیش کرتا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا" ایک ایسی بلاغت نظر ہے جس کو اوسط درجہ کا ذہن مجذوبیت کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔[1]

احتشام حسین لکھتے ہیں:-

"انگڑائی اور اُس کی مصوری کا تعلق خارجی نقش ونگار سے تھا۔ مگر یہاں عالم اور ہی ہوگیا۔ وہ انگڑائی شاعر کی زندگی کا ایک راز بن کر ہمیشہ کے لئے اُس کی یاد میں قائم رہ گئی۔ یہ شعر مصوری کی جان ہے اور شاعری کے مجسم ہونے کا انتہائی کمال[2]۔"

عزیز کے وہ اشعار بڑے پر کیف ہوتے ہیں جن میں لطیف اشارے ملتے ہیں اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد سمجھ میں آجاتے ہیں ان اشاروں کو ڈاکٹر رفیق حسین[3] نے رومانی انداز بیان کہا ہے۔ ایسے چند شعر یہاں پر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:-

عشق کی مجبوریاں کیوں کر کہیں کس سے کہیں   مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا

---

[1] دو دش فرد اص ۹۹

[2] نیساں ص ۱۹۳

[3] الہ آباد یونیورسٹی میگزین (اردو) اپریل ۱۹۵۵ء

دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے — تیرے ہر انداز کو چھپ چھپ کر کوئی دیکھا کیا

خود بخود ٹوٹ گئے بندِ قبا جب ان کے — کیا دکھاتی ہے ہمیں دیکھئے تاثیرِ بہار

دوسرے کی انتہا و ابتدا تخئیل ہے — اِک سرا تو ہے ہمارے پاؤں میں زنجیر کا

مرے بعد آنیوالے سر دھنیں گے خون رو دیں گے — لکھے جاتا ہوں ایسی بات اِک دیوارِ زنداں پر[1]

پہلے شعر میں جو، دوسرے میں کوئی، تیسرے میں کیا، چوتھے میں وابستہ تخئیل اور پانچویں میں ایک کے اشاروں سے شعر میں عجب حُسن پیدا ہو گیا ہے۔

عزیز کے یہاں لکھنؤ کے خاص تعیش پسندانہ ماحول کے نمونے بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ لکھنؤ کا رنگ پسند نہیں کرتے تھے لیکن ہر شاعر کسی نہ کسی طرح اپنے ماحول سے متاثر ہو ہی جاتا ہے۔ عزیز بھی کبھی کبھی اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنی افتادِ طبع کے خلاف رنگین اشعار کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے اس اثر سے عزیز کی غزلوں میں خوش دلی کی منزلیں بھی کہیں کہیں آ گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں کیف و سرور اور طرحداری و دلکشی موجود ہے ؎

نہ اٹھے گی کسی کم سن سے مدتوں جب تیغ — وفورِ شوق میں خنجر بکف شباب آیا

طولِ شبِ فراق کو ایسے میں دیکھ لو — الجھی ہوئی ہے زلف دلآویز شانے میں

عزیز سر بہ زانو وہ زمانہ یاد ہے تجھ کو — پڑی تھیں چاندنی باہیں کسی کی تیری گردن میں

کٹنا کسی کا رمس کی شب بھولتا نہیں — اب سو رہو عزیز بہت رات آ گئی

وہ بادۂ شبانہ کی مستی وہ دورِ جام — اب تک مزے ہیں یاد شبِ ماہتاب کے

---

[1] یہ شعر عزیز کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے۔ ایک غیر مطبوعہ نسخہ میں ہے۔ یہ نسخہ محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

بادہ آشام جھومتے اٹھے / وہ کھلا میکدے کا در دیکھو

نیا نیا جو کسی شوخ کا شباب آیا / اٹھا کے آئینہ دیکھا تو خود حجاب آیا

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں / ادھر آؤ تم کو گلے سے لگالیں

بھلا ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے / کہاں تک طبیعت کو اپنے سنبھالیں

کہو بزم جمشید کے ساقیوں سے / فقیر در میکدہ کی دعا لیں

عزیز کے ناقدین میں سے ان اشعار کے لئے نعرہ تحسین بلند کیا گیا اور یہ آرزو بھی کی گئی کہ کاش ایسے اشعار زیادہ ہوتے جس سے غزل میں حسین شعروں کا اضافہ ہوتا۔[۱]

عزیز نے قدیم شعرا کی تقلید جدید رنگ میں کی ہے مگر ان کے یہاں کسی کی کورانہ تقلید نہیں ملتی۔ وہ خود ایک طرز کے مالک ہیں۔ یہ بات مثالوں سے پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے۔ مثلاً محبت کی شرع قدیم میں عاشق کا اُف کرنا بھی ناجائز تھا۔ نہایت خاموشی، ادب اور سپردگی کے ساتھ معشوق کے مظالم جھیلتے رہنا ہی عاشق کا مذہب تھا۔ میر کا شعر ہے ؎

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا / پھر اُس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

اس مقام پر میر کے مقلد ہوتے ہوئے بھی عزیز میر کی پیروی نہیں کرتے اور وہ کچھ نہ کہنے، کو نہیں مانتے ہیں۔ عزیز کہتے ہیں ؎

ضبط غم کی کوششیں بے فائدہ ہیں اے عزیز / جس کو وہ رسوا سمجھتے ہیں وہ رسوا کیوں نہ ہو

وہ کون لوگ ہیں جو ضبط عشق کرتے ہیں / نہاں کیے سے ہمارے نہاں نہیں ہوتا

غالب کا عاشق بھی حسن کے سامنے زبان کھولتے ڈرتا ہے کہ کہیں

---

[۱] الہ آباد یونیورسٹی میگزین (اردو) ۱۹۵۵ء صہ ۹

توہینِ حُسن نہ ہو اور اس گستاخی پر زبان قطع نہ کر دی جائے ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

عزیزؔ یہاں پر غالبؔ کی تائید نہیں کرتے وہ بات کرنے پر مصر ہیں ؎

دم الٹ جائے گا عزیزؔ عزیزؔ — رہ نہ خاموش کچھ تو کر باتیں

رسمِ دنیا پر بگڑنا بھی نرالی بات ہے — قابلِ شکوہ جو باتیں ہوں تو شکوہ کیوں نہ ہو

عزیزؔ جب ضبطِ گریہ کی تعلیم دیتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ گریہ آدابِ عشق کے خلاف ہے۔ ان کے یہاں اس کی وجہ کچھ اور رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

عزیزؔ اب ضبط سے بھی کام لے کچھ — ارے مر جائے گا کیا روتے روتے

رشک کا مضمون بھی تمام شعراء نے نظم کیا ہے۔ عزیزؔ نے اس مضمون کو بھی نظم کرنے کے لئے ایک نیا راستہ اپنایا ہے ؎

رشک سے روح پہ بیداد کیا کرتے ہیں — روک کر سانس انھیں یاد کیا کرتے ہیں

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عزیزؔ نے اپنی غزلوں میں جدت اور ندرت پیدا کی ہے جذبات اور واردات قلب کی سچی تصویریں کھینچی ہیں جس بات کو جیسا محسوس کیا اُسی طرح لکھ دیا۔

عزیزؔ نے غزل کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے قدامت پرستی چھوڑ کر جدید ہیت کی راہ لی ہے۔ آپ نے غزل میں داخلی اور خارجی سبھی قسم کے موضوعات نظم کئے ہیں۔ اس کے لئے علائم بھی اپنائے ہیں، مثلاً ساقی، میخانہ جنون، زنداں، زنجیر، بہار و خزاں، بلبل و آشیاں، صیاد و قفس، شمع و پروانہ طور و موسیٰ، لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، یوسف و زلیخا، کعبہ و بتخانہ، کفر و ایمان

رند و زاہد، مسجد و مندر، اور مریض و مدفن وغیرہ۔ ان علائم (SYMBOLS)
کے استعمال سے اشعار میں ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ان علامتوں کا
بامعنی اور بر محل استعمال بہت مشکل ہوتا ہے۔ عزیز ان سے کام لینے میں
بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کا حیراں ہونا ‏ ‏ وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

عزیز نے اپنی غزلوں میں مختلف موضوعات جیسے بیمار اور اس کی مختلف
حالتیں، دعوتِ عمل، اخلاق، تصوف، شیخ کی مدح اور قدح۔ سیاسی حالات
شخصی حوالے۔ نفسیاتِ انسانی، حقیقتِ دنیا، مغربی علوم کی ضرورت۔ مقامِ
عشق۔ فلسفیانہ مسائل، انسان کے اوصافِ حمیدہ، بانکپن، تعلیم، خودداری
حب الوطنی، مذہبی عقائد اور شاعری کے گرتے ہوئے معیار وغیرہ پر روشنی
ڈال کر یہ واضح کر دیا کہ بقول مجنوں گورکھپوری، غزل کے مضامین اتنے
ہی زیادہ وسیع اور متنوع ہیں جتنا کہ خود انسان کی زندگی کے حالات و واردات[1]
اب عزیز کے دیوان سے اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو مختلف مضامین پر مشتمل
ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عزیز نے غزل کے دائرے کو کس قدر وسیع کرنے
کی کوشش کی ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

نبض بیمارِ شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی ‏ ‏ اٹھ گئے تیمارداروں سے یہ کہکر دم شناس

سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا ‏ ‏ کسی نے نزع کی اس طرح گتھیاں سلجھائیں

فرصتِ زیست کم ہے کام بہت ‏ ‏ کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

عزیز اس عہد میں احباب کے اخلاق ایسے ہیں ‏ ‏ بظاہر دوست اور خنجر چھپے ہیں آستینوں میں

---

[1] شعر و غزل از رسالہ نگار جنوری فروری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۸

دنیا کو مٹایا ہے اسی طرز عمل نے — جو دل میں ہمارے تھا زباں پر وہ نہیں تھا

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا — نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا

کوثر کی موج کہتے ہیں جس کو جناب شیخ — بت بھی زلال دیں گے اسی آستیں سے ہم

واعظ! یہ وعظ آپ کا کیا ہوا اثر پذیر — واقف ہوں ہیں جناب کے مافی الضمیر سے

واعظ کی قدر آج سے کچھ ہو گئی عزیز — وہ درد لے کے آئے ہیں، دل میں کہیں سے ہم

عبا میں بت ہیں بغل میں صراحی مے ناب — حذر ہے حضرت واعظ کی پاکبازی سے

ظاہراً بیہوش باطن میں سراپا ہوش ہوں — دیکھتا جاتا ہوں رنگ محفل اور خاموش ہوں

ایک ہم ہیں کہ کسی بات کا مقدور نہیں — ایک وہ ہیں کہ کسی رنگ میں مجبور نہیں

کب خیالات پہ ممکن ہے کسی کا پہرہ — دل تو آزاد رہا، میں اگر آزاد نہیں

ابرؔ[1] آزاد زمانہ کو مقید نہ کرو — کون اشعار ہیں پابندِ قوافی ہوگا

مگر بھولے نہیں ہو یاد اب تک ابروِ جاناں کی[2] — عزیزؔ آخر وہ قوت کیوں نہیں باقی رہی دل میں[3]

جوشؔ و اثرؔ و آنؔ و جگرؔ کیفیؔ و نشاطؔ — یہ گل ہیں میرے گلشنِ بے خار کے لئے

اکبرؔ و اقبالؔ و حسرتؔ اور عزیزؔ — معجزے ہیں یہ اسی زمانے کے

مرے دل کو کہے گا جو مجھے حال آئے گا اس پر — کلام حافظِ شیراز ہو یا شمس تبریزی

اس نے پوچھا مزاج کیسا ہے — دل جو امڈا ہوا تھا بھر آیا

---

[1] حکیم محسن خاں ابرؔ لکھنوی رسالہ "معیار" (لکھنؤ) کے مدیر تھے۔ شعرا کو قوافی بھیج کر غزلیں کہلواتے اور "معیار" میں شائع کرتے تھے۔

[2] عزیزؔ کی حیات کے باب میں ان کا ذکر موجود ہے۔

[3] بظاہر اس قسم کے اشعار کی گنجائش غزل میں نہیں معلوم ہوتی مگر دامنِ غزل کو وسعت دینے کے لیے یہ اضافے کئے گئے ہیں۔

بساطِ دہر سے دھوکا نہ کھانا
کہ یہ دامِ فریبِ آرزو ہے

عزیز اب منطق پارینہ کو دہراؤ گے کب تک
علوم مغربی حاصل کرو پیدا ہو کچھ تیزی

نشیمن میں رہیں آزاد کیوں کر
چمن تو خود اسیرِ رنگ و بو ہے

کیوں ہوس آپ سے ملنے کی ہے دن رات مجھے
خود میسر نہیں جب اپنی ملاقات مجھے

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے
فاش اگر پردۂ اسرارِ حقیقت کرتا

نفس امارہ کو آمادۂ طاعت کرتا
ہوش آتے تو عزیز اپنی عبادت کرتا

پھاند پڑنا آگ میں سمجھا ہے معمولی سا کام
کہہ دیا ہے شمع کے شعلے نے پروانے کیا

صحیفۂ عشق کا کرتا ہے جب کوئی تصنیف
وہ میرے نام سے اب انتساب ہوتا ہے

قیامت بھی عزیز اک نام ہے فریاد کا میری
فروغ اس بزمِ ہستی کا فقط ضبطِ فغاں تک ہے

خاک دانِ دہر کی بنیاد ہی کیا تھی عزیز
میری ہستی نے فقط عالم کو عالم کر دیا

علم کا دورہ لہو کے ساتھ رگ رگ میں رہے
جوہرِ قابل اگر ہو قوتِ عامل بنو

غرق ہو کر در بنو موتی خود اپنے واسطے
ڈوب کر ابھرو تو اوروں کے لیے ساحل بنو

حسنِ آراستہ قدرت کا عطیہ ہے مگر
کیا مرا عشقِ جگر سوز خداداد نہیں

انجمن کیسی تم اپنی ذات سے ہو انجمن
گوشۂ خلوت میں بھی بیٹھو تو اک محفل بنو

وادیٔ غربت میں بھی یادِ چمن آ ہی گئی
لے کے بادِ صبح پیغامِ وطن آ ہی گئی

دل کو ان تاروں بھری راتوں نے بہلایا بہت
پھر بھی غربت میں مجھے یادِ وطن آ ہی گئی

ہو گئی بازیچۂ اطفال بے شوق و شعور
شاعری جو تھی مرادف معنیٔ الہام کی

عزیز افسردہ ہوں طرزِ سخن سے
بہت عامی مذاقِ لکھنؤ ہے

یکتائی سمجھے ہوئے ہیں جو تناسب کو فقط
چاہیئے اصلاح اُن کو اِس خیالِ خام کی

شعر کہنے کا سلیقہ نہ سمجھنے کا شعور
کر دیا کاہل فن قافیہ پیمائی نے

عزیز کے کلام کی ایک یہ بھی خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اُس میں عشق و تصوف

کی کہیں کہیں بڑی تہ داری اور معنی خیز آمیزش ہے۔ اُن کی غزلوں میں عاشقانہ اور عارفانہ اشعار ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی عزیز نے یہ طریقہ اختیار کرکے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے ایک بڑے نقص کی تلافی کردی، متقدمین اور متوسطین کے کلام میں جو خلیج متصوفانہ کلام کی چاشنی نہ ہونے سے پیدا ہو گئی تھی، ان کی کوششوں سے رفتہ رفتہ دور ہو گئی[1] اس ز‌منمن کے کچھ اشعار قلمبند کئے جاتے ہیں ؎

اب کی دیوانہ بنادے گی یہ برسات مجھے	واعظوں کی یہ حکومت یہ گھٹاؤں کا ہجوم
کہ دورِ آخری تک کس طرح پیمانہ آتا ہے	یہ منظر دیکھنے جو ہے سوئے میخانہ آتا ہے
نظر حدِ نظر تک جلوۂ مستانہ آتا ہے	سویرے خشتِ خُم سے بادہ کش جب اٹھاتے ہیں

عزیز کو لفظ، بحر، قافیہ اور ردیف کے انتخاب پر بھی قدرت حاصل تھی۔ بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر ان چیزوں کے حُسنِ انتخاب سے کبھی کبھی ان کے اشعار میں بڑا ترنم اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے،[2] جیسے

کاش یہ تارا ٹوٹا ہوتا	دِل کا چھالا پھوٹا ہوتا
دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا	شیشۂ دِل کو یوں نہ اٹھاؤ
باغ کا بوٹا بوٹا ہوتا	چشمِ حقیقت بیں اک ہوتی
زخم کا ٹانکا ٹوٹا ہوتا	خیر ہوئی اے جنبشِ مژگاں
خانۂ دل کو لوٹا ہوتا	آج عزیز اس شوخ نظر نے

عزیز کی غزلوں میں تلمیحات بھی ملتی ہیں مگر عزیز کے یہاں ان کا دائرہ اتنا

---

[1] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۵۰۲

[2] تنقید و تجزیہ صفحہ ۹۴

وسیع نہیں ہے جتنا کہ اقبال کے یہاں، زیادہ تر موسیٰ، طور، ابراہیم، نمرود، یعقوب، یوسف، زلیخا، محمود، ایاز، مصر اور کنعان وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً

دل خلیل امتحان گاہِ وفا — سوزشِ دل آتشِ نمرود ہے

تھا دل فریبیٔ مہہ کنعاں کا کچھ خیال — پیشِ نگاہ آپ کی صورت بھی آ گئی

موسیٰ کی بیخودی نے وہ نقشہ مٹا دیا — تصویر کھینچ چکی تھی تری جلوہ گاہ کی

چراغِ راہ نہ بنتے جو دیدۂ یعقوب — تمام عمر یوں ہی وقفِ جستجو ہوتی

محاوروں کے نظم کرنے پر بھی عزیز کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی محاورے کو مختلف معنوں میں بڑی خوبی سے نظم کرتے جاتے ہیں مثلاً، عالم، کے لفظ کو دیکھئے کہ عزیز کس کس انداز سے نظم کرتے ہیں ؎

بنا ہے مرکزِ تاثیر غم بیمار کا چہرہ — یہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے

کھلا یہ راز ہم پر جب طلسم زندگی ٹوٹا — کہ خاموشی میں تو کچھ اور ہی عالم نکلتا ہے

قدم تک آ کے کہہ دی زلف نے سرگزشت اپنی — جب اتنی عمر آ جائے تو اک عالم نکلتا ہے

ایک جگہ "عالم" کو حال (کیفیت) کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ دوسری بار دنیا والے مراد ہیں۔ تیسری مرتبہ جوہرِ خاص اور چوتھے مقام پر کمالِ حسن کا مفہوم رکھتا ہے۔

عزیز کی زبان عام طور سے سلیس اور عام فہم ہے مگر کہیں کہیں انھوں نے اپنے تبحرِ علمی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ فارسی کے ہی نہیں بلکہ عربی کے نامانوس اور ادق الفاظ تک نظم کر دیئے ہیں جن کی جگہ دامنِ غزل میں مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ ان کے استعمال سے تاثر میں کمی آ گئی ہے، مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

عزیز اب چپ رہو بس حسنِ عالم سوز کو خود بھی — فروغِ گرمیٔ ہنگامۂ محفل پسند آیا

صاف باطن دیر سے ہیں منتظر — ساقیا! خذ ما صفا دع ما کدر

رُت بدلتے ہی فضا میں گونج اٹھا | نغمۂ یا ایہا الساقی ادر
سن لے فریادِ عزیزِ جاں بلب | ربِّ اِنّی مستغیث فانتصر

ایسی غزلیں غالباً حلقۂ علماء میں رہنے کی وجہ سے عزیز نے کہہ ڈالیں وہاں فارسی تراکیب اور عربی الفاظ کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے علمائے دین ایسے اشعار کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی ماحول کے اثر سے متعدد نامانوس مشکل ترکیبیں، اور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً تعجیلِ مرگِ ناگہاں بذلہ گفتاری، معجزہ رجعت پیمانہ، گردشِ طالع کی ماہیت، رگِ برقِ جہندہ معتکفِ استغنا، شریکِ شوریٰ، علتِ صہبا، تمرد، داغ شعلہ خوار اور شبنم رقیق انقلاب وغیرہ مگر اس قسم کے غریب الفاظ و تراکیب والے اشعار کے مقابلہ میں ایسے شعر زیادہ ہیں جو سہلِ ممتنع کی مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں مثلاً سے

ہجر کی رات یاد آتی ہے | پھر وہی بات یاد آتی ہے
تم نے چھیڑا تو کچھ کھُلے ہم بھی | بات پر بات یاد آتی ہے
تم تھے اور ہم تھے چاند نکلا تھا | ہائے وہ رات یاد آتی ہے
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی | اب تو دن رات یاد آتی ہے
مے سے توبہ تو کی عزیز مگر | اکثر اوقات یاد آتی ہے

عزیز کے بہت سے ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے یہاں میر و غالب کی پیروی یا نیز قدیم اور جدید دونوں عہدوں کا رنگ موجود ہے جب ہم عزیز کے کلام کو ان کے معاصرین اور متقدمین کے کلام کے ساتھ دیکھتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ جیسے

عزیز اور غالب :-

گرنی تھی مجھ پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر — غالب

جلوۂ حسن دکھانے کو وہ راضی تو ہوئے — مگر اس کو کہ جسے طاقتِ دیدار نہ ہو — عزیز

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے — غالب

چارہ گر تھا جو مرے زخمِ جگر کا کل تک — آج دیکھا تو وہ خود لائقِ درماں نکلا — عزیز

تنگ آگیا طبیعتِ دشوار پسند سے — وہ کام بگڑتا ہے جو مشکل نہیں ہوتا — غالب

میری دشوار پسندی نے کیا مجھ کو ہلاک — کسی مشکل کو نہ سمجھا کبھی مشکل میں نے — عزیز

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں — غالب

ایک ہی جلوہ ہے جب ہنگامہ آرائے شہود — پھر وہی شاہد وہی مشہود ہونا چاہیئے — عزیز

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں — غالب

پہلے کچھ ایذا اٹھی دردِ عشق میں — اب وہی تکلیف راحت ہو گئی — عزیز

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی — غالب

روح عالم میں پھونک دی تو کیا — میری جانب تو اک نظر نہ ہوئی — عزیز

اِن ہم خیال شعروں کے علاوہ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو فکر کی رعنائی اور طرزِ ادا کی ندرت میں غالب کا رنگ رکھتے ہیں۔ جیسے عزیز کہتے ہیں ؎

آنسو میں ضبطِ شرحِ تمنا کرے کوئی — قطرے میں غرقِ وسعتِ دریا کرے کوئی

مدِ نظر ہو عشق میں گر وسعتِ نظر — ذرہ کو دشت قطرہ کو دریا کرے کوئی

ذرا یہ انتخاب اُس کی نگاہِ ناز کا دیکھو — کہ آنسو بن رہا تھا جو وہ خونِ دل پسند آیا

اللہ اللہ یہ طریقہ ترا اے شعلۂ طور — کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

اُس وقت عشق محو تھا اپنے ہی جلوے میں — جب حسن خود نہ زینتِ بزمِ وجود تھا

اِک اُداسی پہ ہے موقوف مری دلچسپی — گھر ہی ویران ہے جب سیرِ بیاباں کیوں ہو

عزیز نے زیادہ غزلیں غالب ہی کی زمین میں کہی ہیں جیسے الف ہی کی ردیف کو دیکھو؎

عزیز	غالب
جو یہاں محوِ ماسوا نہ ہوا	درد منت کشِ دوا نہ ہوا
آپ کا تیرِ نظر یاد آیا	پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل کو جہاں سکون ہوا جسم سرد تھا	دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
گلہ کس سے جب اس کو اضطرابِ دل پسند آیا	شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
دیکھ کر سرِ در و دیوار کا حیراں ہونا	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
جان دی تو پھر ان کو دردآشنا پایا	کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
طبقۂ خاک میں اک عالمِ پنہاں نکلا	شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
غمِ عشق اگر ملا تھا تو کبھی قرار ہوتا	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
دل جو رہتا تو نہ میں بے سر و ساماں ہوتا	دل ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا

غالب کا رنگِ تغزل جتنا عزیز نے اپنایا ہے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ عزیز نے یہ رنگ ایک اہلِ بصیرت کی طرح اپنایا۔ کہیں پر اندھی تقلید نہیں کی۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی یہی خیال ہے[1]۔

عزیز اور میر

ایک سب آگ ایک سب پانی	دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں	میر
سینہ میں اک جہنم آنکھوں میں ایک طوفاں	کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا	عزیز
سب پہ جس بار نے گرانی کی	اُس کو یہ ناتواں اٹھا لایا	میر
کردیا انکار ازل میں جس سے ہر دلگیر نے	وہ مری قسمت میں لکھا کاتبِ تقدیر نے	عزیز
میرے غم کی یہ حقیقت ہے کہ روزِ خلقت	جو کسی نے نہ لیا وہ مری تقدیر میں ہے	
کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی	شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی	میر

[1] گلکدہ ص ۱۲۰

بگڑ چلی ہے طبیعت عزیزِ وحشی کی — قریب وقت ہے اب آئے اور آئے بہار — عزیز

درج ہوا دیکھنے کی چیز نہیں ہے مگر میر کو پہچان نظر آئی جس سے بہار آنے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عزیز نے بہار آنے کا اندازہ اپنی طبیعت کے بگڑنے سے لگایا جس میں ایک نفسیاتی پہلو حقیقت کا عکس لیے ہوئے ہے۔ اور میر کے شعر سے زیادہ صاف ہے مگر میر ہی کی آواز بازگشت ہے

عزیز اور مومن

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں — مومن

دنیا کو تم نہ تیز نگاہی سے دیکھنا — رازِ فنا نہاں ہے تمھارے نشانے میں — عزیز

بعد مدت اُس کوچہ سے یوں پھر تنگ آ کر — جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا — مومن

راہیں سب شہر کی اک عمر ہوئی بھول گیا — مجھ سے اب ترک ترا راہ گذر کیوں کر ہو — عزیز

عزیز اور حسرت

سر کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں — ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو — حسرت

ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دمِ صبح کبھی — کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا تھا — عزیز

عزیز اور فانی

کوئین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور ان کا — آتے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے — فانی

ہوتا نہیں ہے کوئی زمانہ میں کیا جواں — اللہ کو بھی حد ہے تمھارے غرور کی — عزیز

یا مرے محتاج ہیں اے خونِ دل — یا انھیں آنکھوں سے دریا بہہ گیا — فانی

دریا کبھی رواں انھیں آنکھوں سے تھا عزیز — یا اب ترس رہا ہوں میں رونے کے واسطے — عزیز

عزیز اور صفی

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا — صفی

عمرِ رفتہ کو ذرا آواز دے اے زندگی — سننے بیٹھے ہیں وہ میری داستاں آغاز سے — عزیز

عزیز اور اقبال:۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگِل بھی ہے — انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرلے — اقبال

گلشنِ ہستی ہے میرے واسطے زنداں عزیزؔ — سرو کے مانند آزادی میں پا در گِل ہوا — عزیزؔ

ہم گرفتارِ چمن نیرنگِ ہستی کیا کہیں — یا سرو کے مانند ہیں پابند بھی آزاد بھی

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں نہ ہو صیاد — اقبالؔ

چمن نہیں ہے سزاوار مجھ کو شایاں تھا — کہ بجلیوں کے نشیمن میں آشیاں ہوتا — عزیزؔ

عزیزؔ کے دوسرے دیوان "انجم کدہ" میں ایسے اشعار بہت ہیں جن میں اقبالؔ کے رنگ کی جھلک موجود ہے۔ فلسفۂ حرکت، عظمتِ انسان اور ذوقِ عمل پر اقبالؔ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے معراجِ کمال پر ہے مگر عزیزؔ نے بھی دائرۂ غزل میں رہتے ہوئے ان بلند موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً۔

جہاں ہے پست ملائک کی ہمت عالی — وہاں پہ لیتی ہے دم میری بے پروبالی

خاکدانِ دہر کی بنیاد ہی کیا تھی عزیزؔ — میری ہستی نے فقط عالم کو عالم کر دیا

غرق ہو کر رول دو موتی خود اپنے واسطے — ڈوب کر ابھرو تو اوروں کے لئے ساحل بنو

میں وہ دریا ہوں جسے طوفان نے تعلیم دی — جُز تلاطم حاصلِ عمرِ رواں ملتا نہیں

کبھی کبھی تو پوری غزل اقبالؔ کے رنگ میں نہائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے یہ غزل ؎

دل کو متاعِ نور دو ظلمتِ پردہ پوش کو — دو یہ نوید جانفزا زلفِ شکن فروش کو

سرِّ ازل نہیں مگر ہے کوئی ربط باہمی — تیری نگاہِ ناز سے میرے لبِ خموش کو

مجلسِ وعظ کا مآل ترکِ شراب ہے اگر — سیرِ اسلام آج سے واعظِ خرقہ پوش کو

پی کے سحر کو جامِ مے اہلِ ولا کو مست کر — میکدۂ اثر بنا نرگسِ مے فروش کو

تیرے ہی نام پر ہے بند تیرے ہی نام پر کھلے — قفلِ حریمِ دل بنا میرے لبِ خموش کو

زخمِ دلِ عزیزؔ اگر بڑھ کے دکھائیں فصلِ گل — خونِ بہار نذر دے اپنے نمو کے جوش کو

عزیزؔ اور چکبستؔ :-

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں — مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے — چکبست
کب خیالات پہ ممکن ہے کسی کا پہرہ — دل تو آزاد رہا ہیں اگر آزاد نہیں — عزیز

عزیز کے یہاں ایسا رنگ بھی ملتا ہے جو موجودہ دور کے شاعروں کے یہاں موجود ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عزیز کے دکھلائے ہوئے راستہ پر موجودہ شاعروں نے چلنا پسند کیا۔ جیسے

عزیز اور سالک لکھنوی:۔

مری زباں سے جو قصہ مرا بیاں ہوتا — یقین ہے کہ زمانہ ہی داستاں ہوتا — عزیز
ہمارا حال تمہیں جانتے تھے ہم پہ گزری تھی — جو ہم کہتے تو لطفِ داستاں کچھ اور ہو جاتا — سالک
پھر دیکھ تماشا کہ ابھرتا ہوں میں کیوں کر — جتنا تجھے منظور مٹانا ہو مٹا دے — عزیز
حرفِ غلط نہیں ہوں بیکار ہے یہ کوشش — ابھروں گا اور مٹ کر برباد کر کے دیکھو — سالک

اس سے پتہ چلتا ہے کہ عزیز کی شاعری میں وہ نقوش موجود ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکیں۔ اس تقابل کے بعد سید احتشام حسین کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ:۔

" اگر ہم گلکدہ کے متعلق صرف ایک جملہ میں کوئی رائے دینا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ گلکدہ میں قدیم شعراء کی تقلید جدید رنگ میں کی گئی ہے اس سے حضرتِ عزیز کی شاعری کا کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کسی طرز کی کورانہ تقلید اور غلامانہ پیروی نہیں کرتے بلکہ خود ایک طرز کے مالک ہیں جس میں ماضی کے گلزاروں سے فائدہ حاصل کیا گیا ہے[1] "

عزیز کی نگاہ صرف دوستوں پر ہی نہیں تھی وہ اپنے دشمنوں سے بھی باخبر

---

[1] نیساں۔ الہ آباد یونیورسٹی میگزین جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۲ ۱۹۳۵ء

تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اُن کے کلام میں کوئی عیب رہ جائے گا تو نکتہ چینیوں کی نگاہیں انھیں معاف نہیں کریں گی۔ عزیز کا شعر ہے ؎

دشمن پہ بھی نگاہ رہے عیب بین کی یہ کیا کہ صرف چاہنے والوں کو دیکھیے

لہٰذا اس شعوری کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام میں محاسن کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا جس کا اعتراف عزیز کے ناقدین بھی کرتے ہیں ثبوت کے لئے چند رائیں اختصار کے ساتھ درج کی جاتی ہیں۔ عزیز کے گلکدہ میں جو رائیں طبع ہو چکی ہیں پہلے وہی نقل کی جارہی ہیں :۔

عزیز کی غزلوں پر مبصرین کے خیالات۔ (۱) مولانا ابوالکلام آزاد :

"لکھنؤ کے جدید طرز تغزل میں حضرت عزیز کا کلام ہمیشہ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ گلکدہ کے چند صفحات دیکھے اور کسی صفحہ کو عمدہ اور دل پسند اشعار سے خالی نہ پایا۔ آج کل مرزا غالب کی تقلید عام طور پر پسند کی جاتی ہے۔ لیکن جو فرق تقلید اعمی اور اتباع اہل بصیرت کا علم و مذہب کے ہر گوشہ میں پایا جاتا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ آپ کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی الفاظ و تراکیب و اضافات کے استعمال میں غلو اور افراط سے ہر جگہ پرہیز کرتے ہیں۔"

۲۔ ڈاکٹر اقبال :۔

"یہ مجموعہ غزلیات نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔۔۔ میں نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان آنرز ان اردو کے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے آپ کے کلام کی جدت حیرت انگیز ہے۔"

۳۔ مولانا عبدالحلیم شرر :۔

"مرزا محمد ہادی عزیز لکھنؤ کے موجودہ نامور شعراء میں ہیں جن کا کلام

روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور وہ اپنی جدت طرازیوں اور اپنے کلام کی خوبیوں سے اس کے مستحق ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عزیز کے کلام کے رشیدا سارے ہندوستان میں پھیلے ہیں۔"

۴۔ سید سلیمان ندوی[1] کی ادارت میں نکلنے والا ماہوار علمی رسالہ "معارف" لکھتا ہے:-

"مرزا عزیز کی شاعری کی ممتاز خصوصیات تین ہیں، ۱۔ جذبات نگاری ۲۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال اور باوجود اس کے کلام کی صفائی اور روانی ۳۔ ابتذال سے پرہیز۔۔۔ اشعار پڑھو۔ دیکھو کس قدر اُن کا لفظ لفظ جذبات کے آب حیات میں ڈوبا ہوا ہے اور مصرعہ مصرعہ میں سوز و گداز کے کتنے شعلے بھڑک رہے ہیں۔۔۔ گلکدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصنف نے شعرائے لکھنؤ کے سیکڑوں ہزاروں مبتذل الفاظ و خیالات سے اپنے کلام کو اس قدر بلند کیا ہے کہ غزل کی زمین آسمان بن گئی ہے۔"

۵۔ سر عبد القادر کا رسالہ "مخزن" لاہور:-

"۔۔۔ آپ کا دلگداز کلام جذبات عالیہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے سربرآوردہ سحر نگاروں کی فہرست میں سب سے پہلے اگر عزیز

---

[1] ندوی صاحب نے اکثر عزیز کے کلام کو دوسرے معاصرین کے کلام پر ترجیح دی ہے۔ آپ عزیز کی غزلیں "معارف" میں برابر چھاپتے رہے۔ مولانا عبد الماجد کو ایک خط میں لکھتے ہیں "ریاض کی غزل تو بالکل بے کیف ہے۔ البتہ عزیز کی غزل اسی نمبر میں دے دوں گا" (مکتوبات سلیمانی جلد اول ص ۱۷۱)

کا نام لکھا جائے تو لکھنے والے کو اپنے ضمیر سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اشعار جذبات۔ درد۔ سوز و گداز کی مجسم تصویریں ہیں۔"

۶۔ مرزا محمد ہادی رسوا

..... جناب عزیز نے شاعری کی اس حالت کو واضح کر دیا جو زمانہ کا اقتضا تھا..... آپ نے رنگ بدلنے کا خود قصد نہیں کیا۔ اور خوب کیا۔ جناب عزیز اصنافِ نظم و نثر پر قادر ہیں اور ہر صنف میں آپ کا کلام ملک میں شائع ہو چکا ہے۔"

۷۔ مرزا ثاقب لکھنوی:۔

"..... حضرت عزیز کی طبیعت نہایت پُر درد واقع ہوئی ہے۔ ہر شعر سے حسرت کا اظہار ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ آپ نے میرؔ و غالبؔ کی تقلید کرتے ہوئے اپنے خاص رنگ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ زبان کی صفائی، مضامین کی رفعت، بیان کی سلاست، معنی آفرینی اور نکتہ رسی سے دست و گریباں ہیں۔ آپ کو طبقۂ شعراء میں ایک امتیازِ خاص ہے۔"

۸۔ اکبر الہ آبادی:۔

"لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی سے آپ سے جو مراسم و تعلقات تھے وہ مکاتیبِ اکبر سے ظاہر ہوتے ہیں جس کا مجموعہ دائرۂ ادبیہ نے چھاپا ہے، ذیل کے چند اشعار میں اپنے خلوص و محبت کا اظہار نہایت لطیف و نفیس پیرایہ میں کرتے ہیں:۔

ایک ہی کر دیا محبت نے — خود کو ان کو کبھی نہ دو سمجھے
لوگ کہتے ہیں زندگی کو عزیز — زندگی ہم عزیز کو سمجھے

وجد میں آئے وہ یہ جو سمجھے　　　ہے خدا کا بھی اسم پاک عزیز

اس باب کے آخر میں اسی مجموعہ موسوم بہ مکاتیب اکبر سے کچھ ٹکڑے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

صفی لکھنوی:۔

فضائے لامکاں را می شمارد تنگ میدانے　　　چہ شبدیز خیال او کہ ہنگام عناں گردش

۱۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

.... آپ کا کلام نہایت بلند پختہ اور استادانہ ہوتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم انھیں "رئیس الشعرا" کہتے تھے.... آپ کا گلکدہ فی الحقیقت گلکدہ معنی ہے.... ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے۔"

۱۱۔ ولی شاہجہانپوری:۔

"...... باعتبار تکمیل اصناف سخن و تبحر فن دنیائے شاعری میں جناب عزیز کی ہستی ایک ممتاز ہستی ہے۔ اپنے محل پر گلکدہ کا ہر شعر میر کے پر کیف جذبات کا اعلیٰ نمونہ اور غالب کے فلسفیانہ خیالات کا حیرت انگیز آئینہ ہے...."

۱۲۔ محوی لکھنوی:۔

"..... جناب عزیز دور حاضر کے ان شعرا میں ہیں جنھیں کم از کم لکھنؤ میں ایک حد تک مجتہد سخن کہنے کا حق ہے۔ جناب عزیز کا ہر شعر بجائے خود ایک عالم کیفیت اور ایک مستقل دنیائے جذبات ہے۔۔"

۱۳۔ شمس العلما مولانا سید ناصر حسین

سلیل الاطائب حمید الضرائب شامخ المناقب رفیع المراتب الادیب الملمعی والاریب اللوذعی مجمع المحاسن الجلیلہ و مغرس المآثر الجمیلہ جناب

مولوی مرزا محمد ہادی صاحب المتخلص باعزیز خصہ اللہ بصنوف الاکرام والتعزیز نہایت باکمال بزرگوار ہیں قطع نظر اِس کمال کے جو کہ ادب فارسی و فنونِ شاعری میں حاصل ہے۔ زبان عرب اور اس کے فنونِ ادب میں بھی عمدہ سلیقہ ہے اور کتبِ معقولات کو بھی موصوف الصدر نے اچھی طرح حاصل کیا ہے۔

۱۴۔ شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن

مرکزِ فضل وکمال عزیز عزیز المثال ادیب شیریں مقال جناب مرزا محمد ہادی صاحب، عزیز زاد اللہ قدرہ، وشرح صدرہ رضا بدرہ عربی فارسی کے جید الاستعداد فاضل اور اردو ادب کے استادِ کامل ہیں۔ ان کے کلام کو ہر طبقہ میں خاص مقبولیت کا شرف حاصل ہے اور ہر قلب ان کے کلام کی جلالت وجزالت کا معترف ہے۔ میں بھی ان کے کلام کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور انھیں ماہرِ فن تسلیم کرتا ہوں۔

۱۵۔ شمس العلماء مولانا عبدالمجید فرنگی محلی

عزیز ہر دلعزیز جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز متعہ اللہ بالفوز الکبیر والفیض العزیز نے میرے پاس درس جماعت میں شرکت کی اور منطق و حکمت کی کتابیں نہایت محنت و مشقت کے ساتھ پڑھیں۔

۱۶۔ مولانا شیخ فدا حسین ـــــــ:۔ لکچرار فلاسفی ممبر آف پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی آپ کی نسبت ایک انگریزی عبارت میں تحریر کرتے ہیں جس کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے۔

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنؤ کے ایک مشہور معروف شاعر کئی ماہ تک عربی

میں میرے متعلم رہ چکے ہیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے کئی مستند کتابیں عربی علم و ادب کی پڑھیں اور نہایت جانفشانی سے مصروف رہے۔ بسا اوقات میں ان سے عربی تصانیف پر اہم اور ادق سوالات کیا کرتا تھا اور وہ اس کے محاسن کو عربی میں باتفصیل سمجھاتے تھے اور میرا خیال ہے کہ ان کو اس کام میں ایک خاص دلچسپی تھی۔ ان کے تشریحات نہایت بامعنی اور قابل اطمینان ہوتے تھے جب سے میں ان سے واقف ہوں میں نے ان کا اخلاق اور حسن ادب اور دیگر اوصاف حمیدہ اپنے طرز میں یکتا پائے ہیں۔ میں ہمیشہ ان کا مداح رہا ہوں۔

۱۷۔ جناب علامہ آقا سید احمد استر آبادی :۔ جن سے حضرت عزیز نے دیوان عنترہ پڑھا تھا آپ کے ایک فارسی قصیدہ کو دیکھ کر تحریر فرماتے ہیں۔

الحق باوجود آنکہ زبان مادری ایشان اردو ست و محاورات ایرانی را کمتر از اہلِ ایران واقف اند اما دریں قصیدہ کمال زبان دانی بخرچ دادہ اند و مصداق ان من البیان لسحراً آشکار کردہ اند

آں کہ اندر نظم ذوقش زینت افزا بود — درمیانِ ہمگنان خویش بے ہمتا بود
لطف شورش در تغزل وجد آرد روح را — سوز نظمش در رثا سوزندۂ دلہا بود
شعر او در ہر زبان اردو بود یا فارسی — ہر یک از اشعارِ او یک گوہر یکتا بود

ایک مستقل قصیدہ میں حضرت عزیز کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، چند شعر اس کے حسب ذیل ہیں:۔

کامراں مرزا محمد ہادی ان کانِ ادب — صاحبِ افکارِ بکر و شاعرِ شیریں کلام
آں ادیبے کز بیانش می برد روحِ بشر — لذت کہ صحبت معشوقہ شنگے مستہام
چوں نشیند بر سمندِ طبع در انشاء شعر — می رود خیلِ فصاحت با سمندش ہم لگام

اے تعالیٰ اللہ ازیں طبع بلند اندازِ او   بارک اللہ زیں بیانِ دل پسند با قوام
ہاں مگو اردو زبانی چوں تو ایں تحریق چیست   فارسی اشعار ہم دیدم تو دے چندیں مقام

۸۔ زبدۃ العلما جناب مفتی سید محمد علی صاحب ابن علامہ مفتی سید محمد عباس صاحب طاب ثراہ جو حضرت عزیز کے بچپنے کے دوست ہیں ایک قصیدہ میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں جس کے بعض اشعار ہدیہ ناظرین ہیں۔

الی العزیز القادر الذی حوی   کل الثناء وات العزّ من تشاء
ثم الذی قد اصطفاہ ربّہ   ثم الاولیٰ ایمانہم فاق الوریٰ
علیہم الصلوٰۃ ما ابتسمت   فی الروضۃ الغناء انما الحمیٰ
وبعد فاعلم لا تزل ذا نعمۃ   ان الذی اعزہ ربّ العلیٰ
وباسمہ قد خصّہ اعزیہ   ذا عزۃ فسما عزیزا سامیا
حوا بن انسی قد نشئت وعوی   تربُ ھمیم الوجہ من عہد الصبا
قد کان ساقینا مدامۃ معًا   عیش مضی یا حبذا عیش مضی
ثم ارتقیا فہو اضحیٰ شاعرًا   وذرت کاسبا لما تحت کربلا
خیالہ من شاعر ذی مقول   کان بالتسنیم قد تضمنا
بلقیک محصوصا ولکن شعرہ السامی علا اعلام السما معا علا
لطیف معنی لہ رقیق لفظہ   تعاقما کالتبر لمّا صوّغا
لولا تقبلہ لی تعلقت منصفا   ما ان اری من مثلہ ما ان اریٰ
فانّہ الاستاذ فیہ بل ولو   وجدت اعلیٰ منہ اعطا فلست ذا
کسالان الہند بعد اذ کبا   وذرک من افضال اصحاب الکسا
کسر فاخ من اللہ العالی منہ اذا   حاجت بہ انطقہ دع القضیا

۱۹- حضرت ذکی جائسی :- باکمال شعرا میں تھے اور فارسی میں نہایت اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ حضرت عزیز کی نسبت فرماتے ہیں :-

اے بحرِ علم کانِ فن و معدنِ سخن
گنجینۂ جواہرِ درِ ثمیں توئی

تاکیست آنکہ پیشِ تو لافِ سخن زند
در شعر فخرِ غالب و در شکِ حزیں توئی

نازد بگوہرِ تو سلیمانِ شاعری
انگشترِ کمالِ سخن را نگیں توئی

ہرگز نزاد مادرِ گیتی عدیلِ تو
بیمثل اے عزیز بروئے زمیں توئی

عالم ہمہ ز نگکدۂ تو معطر است
گلدستہ بند نسترن و یاسمن توئی

۲۰- مولانا ظفر علی خاں :-

حقیقت یہ ہے کہ آپ غالب کے ہمصفیر ہو کر جس کا رنگ آپ کے کلام میں نظر آ رہا ہے یہ کہہ سکتے ؎

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

۲۱- مرزا حبیب حسن صاحب بی اے فیلو آف الہ آباد یونیورسٹی
کلام عزیز نے اردو لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔

۲۲- مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدر آباد
لکھنؤ میں یہ دم بہت غنیمت ہے۔

۲۳- پروفیسر ناصری مرحوم ایم ۔ اے

حبذا اے جودتِ طبعِ عزیزِ خوش بیاں
حاجت باشد دریں ہنگامہ دارائے کمال

حکمرانی کرد در اقلیم سہلِ ممتنع
شد اسیرِ دامِ فکرش بسکہ عنقائے کمال

خامۂ معجز نگارت شاخِ طوبیٰ النظیر
وز مدادش می چکد ہر نقطہ سودائے کمال

شاہدِ طبعش مہِ کنعاں یا در رفتگان
می زند پہلو بہ پہلوئے زلیخائے کمال

ہر یکے از نقطہا خورشید گردونِ سخن
ہر یکے از نقطہا نورِ سویدائے کمال

۴۴۔ مدینہ[1] (رسالہ)

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی اردو کے ان چند مایہ ناز شعرا میں سے ہیں جو غالب مومن کی یاد کو تازہ کر دیتے ہیں جن کی وجہ سے آج بھی اصلی شاعری کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ حضرت عزیز کے ادبی معجزات پر دنیا ایمان لا چکی ہے۔ طرز ادا کی ندرت اور خیال آفرینی آپ کا حصہ ہے۔ "من تماشائے فروشِ دلِ صد پارہ خویشم" کا حقیقی مطلب حضرت عزیز ہی کی شخصیت اور ان کے جواہر افکار سے مشرف ہو کر سمجھ میں آتا ہے۔

۴۵۔ خطیب (رسالہ)

جناب عزیز کا دل و دماغ جدت تخیل اور معنی آفرینی کا مخزن ہے۔ پامال مضامین سے بہت ہی اجتناب کیا ہے اور یہ بات شاعری میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لیاقتِ علمی کے سوا اساتذہ کے کلام کو بہت ہی غور و خوض سے دیکھا ہو اور طبیعت جدت پسند ہو جناب عزیز کی سخنوری اور ادیبانہ قابلیت کو سخن فہم حضرات تسلیم کر چکے ہیں اس کا بڑا سبب ان کی علمی قابلیت اور فنِ شعر میں تجربہ ہے وہ محض غزل گوئی نہیں بلکہ اصنافِ سخن پر قادر ہیں۔

گلکدہ کے علاوہ مختلف کتب و رسائل میں ناقدین عزیز نے کلام عزیز کے متعلق اپنی اپنی رائیں دی ہیں۔ ان میں سے چند کی رائیں حسب ذیل ہیں:۔

۴۶۔ نیاز فتح پوری[2] (جلبیت کے تغزل کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں)

---

[1] یہ رسالہ بجنور سے نکلتا تھا سر ورق پر عزیز کا یہ شعر رہتا تھا۔
منجملہ شق القمر کا ہے مدینے سے عیاں / مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

[2] یادِ جلبیت بحوالہ اردو غزل کے پچاس سال، ص ۲۱۲ از ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل

"۱۹۰۵ء میں اُن (چکبست) کے تغزل کا جو رنگ تھا وہ تا مخی تھا نہ امیری بلکہ ایک حد تک اتنا مبہم تھا کہ ہم اُس کو دیکھ کر آئندہ کے لیے کوئی حکم نہیں لگا سکتے تھے لیکن اُس کے پانچ سال بعد اُس نے جو رُخ اختیار کیا وہ وہی تھا جو عزیز لکھنوی نے تکمیل کو پہونچایا۔"[1]

۲۷- ڈاکٹر رام بابو سکسینہ[2] :-

"اب جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتیِ دنیا کا نہایت پُر اثر الفاظ میں پیدا کیا جانا فیشن ہو گیا، حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔"

۲۸- پروفیسر سید اعجاز حسین :-

"عزیز کے اشعار میں الفاظ اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ خود بخود ایک ترنم پیدا ہو جاتا ہے جس سے کلام کی دل کشی اور بڑھ جاتی ہے۔ طرزِ ادا کی ندرت اور خیال آفرینی کا ہر قدم پر خیال رہتا ہے۔ ان کے دل میں اتنا سوز و گداز ہے کہ عام طور سے غزلیں وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کی سرمایہ دار ہو گئی ہیں زبان کے اعتبار سے نہایت صاف اور سلیس ہے۔"[3]

---

[1] عزیز کے "گلکدہ" میں اکثر غزلیں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء کے بیچ کی کہی ہوئی ہیں لہٰذا نیاز صاحب کو یہ لکھنا چاہیئے کہ ۱۹۱۰ء کے بعد چکبست کی غزلوں نے عزیز کے رنگِ تغزل کو اختیار کیا۔

[2] تاریخ ادب اردو ص ۶۶۲

[3] مختصر تاریخ ادب اردو ص ۱۹۹

۲۹- پروفیسر مجنوں گورکھپوری

"عزیز سے اردو غزل کو جو نئے اسالیب اور نئے آہنگ ملے ہیں وہ اپنی نوعیت کے پہلے اضافے ہیں اور ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکے گا- انھوں نے غزل میں معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں۔ وہ بھی یادگار حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی غزلیں پڑھتے وقت ایسا احساس ہوتا ہے جیسے کسی جنازے کے اٹھنے میں اور رد داتہ ہونے میں، ناقابلِ برداشت حد تک دیر ہو رہی ہے۔[1]"

۳۰- ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی

"اصل میں عزیز غزل گو شاعر تھے۔ تغزل ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا غزل کا اندازِ بیان اور لب و لہجہ میر و غالب دونوں سے سیکھا بندش کی چستی اور ترکیب کی ندرت میں غالب کے بعد عزیز کا نام آتا ہے.....[2]"

۳۱- پروفیسر آغا اشہر لکھنوی:-

"... ابتدا میں عزیز مرحوم کا رنگِ تغزل بھی کہنہ پابندیوں اور پارینہ خصوصیاتِ شعر میں رنگا ہوا تھا.... انھوں نے منزل ابتدائی طے کر کے بہت جلد مذاقِ جدید کے نمونے پیش کرنے شروع کر دیے ترکیبیں مضبوط خیالات بلند طرز ادا میں روانی غزل میں قدرے

---

[1] دوش و فردا ص ۱۲۹

[2] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص ۵۱۲ سے ص ۶۷۲

مزہ بھی پیدا کر لیا تھا... حضرت عزیز غالب اور میر کے دلدادہ تھے اور اُن کے رنگ کے صحیح پیرو"[1]

۳۲- وحید الدین سلیم :-

"عزیز اور صفی نے لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ لکھنؤ میں جو رعایت لفظی اور صنعت پرستی کا زور تھا اُس کو ان شاعروں نے ترک کر دیا... یہ دونوں شاعر اب غالب کے دبستان میں داخل ہو گئے ہیں"[2]

۳۳- ڈاکٹر ابو محمد سحر :-

"عزیز کی غزلگوئی اساسی حیثیت سے روایتی ہے... نفسیاتِ انسانی پر اُن کی نظر بہت گہری پڑتی ہے... عشقیہ مضامین کے علاوہ ان کی غزلوں میں اخلاقی صوفیانہ اور رندانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ عزیز کی غزلوں کا رنگ استادانہ ہے۔ زیادہ تر اشعار عام فہم ہیں۔ دورِ جدید میں عزیز کی غزل گوئی غزل کی اصلاح کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ لیکن ان کے یہاں قدرِ اول کے اشعار کم ہیں... معنویت میں غالب اور سوز و گداز اور سادگی میں وہ میر کی عام طور پر تقلید کرتے ہیں"[3]

۳۴- محمد مثنیٰ رضوی

عزیز کا تغزل، میر کے خلوص، غالب کی صناعی، تعشق کی مرثیت اور

---

[1] رسالہ ادب ماہنامہ دسمبر ۱۹۳۵ء (محمود آباد نمبر)
[2] بحوالہ تنقید و تجزیہ از ابو محمد سحر ص ۸۶
[3] تنقید و تجزیہ ص ۸۹

حسرت کی حقیقت نگاری کا نچوڑ ہے۔۔ زورِ بیان کی جتنی اچھی مثالیں اُن کے کلام میں ہیں آرزو کو چھوڑ کر شاید ہی ان کے کسی ہمعصر غزل گو کے یہاں دستیاب ہو سکیں۔۔۔ جو باتیں بری طرح کھٹکتی ہیں ان میں ایک تو وہی مرثیت کی دھن ہے دوسرے یہ کہ اُن کے یہاں زندگی کی بشارت کا کہیں ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا جو انسان میں جینے کی امنگ اور ترنگ بڑھائے نہیں تو کم سے کم اپنی جگہ قائم رکھنے میں مدد دے۔[۱]"

۳۵۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :۔

"عزیز لکھنوی قدیم رنگِ تغزل کی آخری یادگار تھے۔ شاعری میں نئے رجحانات سے متاثر نہیں ہوئے۔۔ تاہم ان کا اپنا خاص رنگ ہے جس میں غالب کے خیال کی گہرائی میر کا سوز و گداز اور اُن کی سادہ زبان ایک سانچے میں ڈھال لی گئی ہے مضامینِ عشقِ حقیقی و مجازی کی ترجمانی سوز و گداز سلاست و فصاحت کے تینوں عناصر سے کلام کی ترکیب ہوئی ہے۔ اُن کا رنگ لکھنؤ کے قدیمی اور روایتی مسلک سے منحرف ہے[۲]"

۳۶۔ ڈاکٹر رفیق حسین :۔

عزیز بھی اپنے ماضی کی اچھی باتوں سے متاثر تھے مگر اپنے ماضی میں گم نہیں ہو گئے تھے۔ قدیم لکھنوی شعراء کے یہاں جو خرابیاں تھیں اُنھیں عزیز نے ترک کیا۔ خشک لب و لہجہ کی جگہ شیوہ بیانی نے لی۔ بے لطف استعاروں اور کنایوں کے بجائے حسین اور رنگین فارسی کی ترکیبیں

---

[۱] عزیز لکھنوی کا تغزل۔ "نگار" دسمبر ۱۹۵۲ء

[۲] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۷۹۶ سے ص ۸۰۳

استعمال کیں... لکھنؤ کے شعر و ادب کی کشتی تو بس منجدھار میں پھنسی نظر آتی تھی۔ عزیز کی کوششیں بس ایسی ہی تھیں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔"[۱]

۳۷۔ سید احتشام حسین:۔

گلکدہ لکھنؤ کے ایک شاعر کا مجموعۂ غزلیات ہے اور اُس دور کی شاعری میں وہ ہر جگہ کے شاعر کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے... لکھنؤ کی شاعری اُسی طرف آنا چاہتی تھی جسے حضرت عزیز کامیابی کے ساتھ لائے ہیں۔ انھوں نے ایک شاعر کی طرح اپنے قلب و جگر کے ٹکڑے پیش کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر لفظ جذبات انسانی کی تصویر پیش کرتا ہے..."[۲]

---

[۱] الہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین ۱۹۵۵ء

[۲] نیساں ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۹۳ (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اردو کے قصیدوں نے فارسی کے قصیدوں کا تتبع کیا۔ وہی شوکتِ الفاظ وہی نزاکتِ خیال، وہی معنی آفرینی اور وہی مبالغہ آرائی اردو کے قصیدوں کا بھی معیار ٹھہرا۔ قصیدہ کے اِس معیار کو پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رکھنے کا سہرا سوداؔ کے سر رہا۔ ان کے بعد والے قصیدہ گویوں نے انھیں کو مشعلِ راہ بنایا۔ ادق گوئی اور علوئے مضامین کو قصیدہ نگاری کا طرۂ امتیاز سمجھا۔ الفاظ و معانی کے مشکلات نے قصیدوں کو ایک مشکل فن بنا دیا۔ اس صنف کی اصل غرضِ تصنیف اکثر بلند ہوئی۔ اخلاقی مضامین اور عظیم ہستیوں کے فضائل کردار نظم کر کے انسانیت کو راہِ راست پر لگانا اس کا اصل مقصد ہے یہ بات ہی الگ ہے کہ شعرا نے اربابِ دولت کی مدح کا کام بھی اس سے لیا اور اِسے حسنِ طلب کا ایک ذریعہ بنایا۔ مولوی امداد امام اثرؔ لکھتے ہیں:۔

"اس صنف میں شاعر اعلیٰ درجہ کے مضامین جو امورِ ذہنیہ اور معاملات خارجیہ پر مشتمل رہتے ہیں موزوں کرتا ہے۔ اگر کوئی قصیدہ اس صفت سے متصف نہیں تو اُس پر قصیدہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہے ----
قصیدہ گوئی شاعرِ حکمت مآب کا کام ہے۔ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسائلِ اخلاق، معاشرت، تمدن، معاش، معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو یا حمد خداوند نعتِ محمد مصطفےٰ، منقبتِ علی مرتضیٰ و ائمۂ باصفا سے شاعر کو ثوابِ عقبیٰ حاصل ہوں اور سامعین کو ذکرِ خدا و رسول و ائمہ سے توفیقِ عبادت پیدا ہو۔ حال کی قصیدہ گوئی نہایت درجہ ابتذال کو پہونچ گئی ہے حتیٰ کہ گدائی کی صورتوں میں سے یہ بھی ایک صورت ہو رہی ہے"[1]
قصیدوں کا یہ طرز یعنی اربابِ دولت کی مدح حصولِ زر کی خواہش اور مشکل گوئی کی روایت سوداؔ سے چل کر منیرؔ شکوہ آبادی اور امیرؔ مینائی تک پہونچتی ہے۔ پھر سیاسی انقلابات نے بیسویں صدی کی شروعات ہوتے ہوتے ہندوستانی سماج کے ڈھانچے کو بدل دیا۔ اصنافِ سخن بھی متاثر ہوئے قصیدوں میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ اربابِ دولت کی مدح سرائیوں کا زور کم ہوا۔ مبالغہ، تصنع، غیر معروف ردیف و قافیہ کا دائرہ تنگ ہوا۔ نئے نئے موضوعات قصیدے میں داخل ہوئے۔ سچے جذبات کی مصوری صدق گوئی اور حقیقت نگاری کو قصیدہ کا معیار سمجھا جانے لگا۔ یہاں سے جدید قصیدوں کا عہد شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے قصیدہ نگاروں میں اسمٰعیل میرٹھی، حالی، نظم طباطبائی

---

[1] کاشف الحقائق ص ۱۹۵ سے ۲۰۰

صفی، محشر اور عزیز کے نام سرِفہرست ہیں۔

اسمٰعیل نے قصیدوں کو نئے موضوعات دیے۔ مثلاً خشک سالی، شب برات عید الفطر، جاڑے گرمی کا مناظرہ، جریدۂ عبرت وغیرہ۔ جریدۂ عبرت میں مسلمانوں کا تنزل اصلاحی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حالی نے زیادہ قصیدے نظام دکن والیٔ رام پور ملکۂ وکٹوریہ اور سر سید وغیرہ کی تعریف میں کہے ہیں۔ دو قصیدے نعت میں بھی ہیں۔ زبان اور اندازِ بیان بالکل فطری ہے۔ ان قصیدوں میں اصلاحی نقطۂ نظر، لطیف طنز، سنجیدہ ظرافت اور ڈرامائی طرزِ اظہار کے نشانات بہت نمایاں ہیں۔ نظم طباطبائی نے سارے قصیدے تاریخی فضا میں لکھے ہیں جن کا موضوع مذہبِ اسلام ہے۔ اسلامی جنگیں نظم کر کے قصیدوں میں رزمیہ کا اضافہ کیا۔ صفی، محشر اور عزیز کے یہاں اربابِ دولت کی مدح میں شاید ہی کوئی قصیدہ اتفاقاً نظم ہو گیا ہو۔ ان شعرا نے حمد، نعت یا منقبت میں سارے قصیدے کہے ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ فنکار متعدد فنون میں دخل رکھ سکتا ہے مگر مہارت صرف ایک ہی فن میں حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً میر نے قصیدے بھی کہے مگر سودا کا مرتبہ نہ مل سکا۔ سودا نے غزلیں بھی لکھیں مگر میر کے برابر نہ ہو سکے یہ ایک عطیۂ فطرت ہے جس کو مل جائے۔ عزیز نے نظمیں بھی لکھی ہیں مگر صفی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ صفی نے قصیدے بھی لکھے ہیں مگر عزیز کے معیار تک نہیں پہونچ سکے۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے تو عزیز کو قصیدہ نگاری میں اپنے عہد کا سودا تک کہہ دیا ہے۔

شعرائے عرب نے قصیدے کی ترکیب چار عناصر سے کی ہے (۱) تشبیب (تمہید) (۲) گریز (۳) مدح (۴) دعا۔ رودکی نے انھیں عناصر کو برقرار رکھا۔

تمام شعرائے فارسی نے رودکی کا تتبع کیا۔ یہی چاروں ارکان اردو قصیدے کے بھی اجزائے ترکیبی ٹھہرے اور یہی قصیدوں کا معیار قرار دیے گئے۔ اب دیکھنا ہے کہ عزیز ان عناصر کو بروئے کار لانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے عرب میں عشقیہ اشعار تمہید کے طور پر لکھے جاتے تھے۔ فارسی اور اردو میں عشقیہ اشعار کی قید نہیں رہی اور جملہ علوم و فنون تشبیب کے دامن میں سمٹ آئے۔ تشبیب میں فنکار اپنی علمی استعداد اور فنی مہارت کا اظہار کرتا ہے اس کے پہلے شعر ہی سے شاعر کے فنی کمالات کا امتحان شروع ہو جاتا ہے اس میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے کوئی نیا انداز، نیا تخیل یا تعجب خیز واقعہ اپنایا جاتا ہے تاکہ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سنیں اور شروع سے آخر تک ان کی دلچسپی قائم رہے۔ مثالاً حسب ذیل مطلع دیکھئے۔

سودا:- اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل + تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

ذوق:- شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت + نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

غالب:- صبح دم دروازۂ خاور کھلا + مہر عالم تاب کا منظر کھلا

عزیز نے بھی اسی طرح اپنی فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ عزیز کے مطلع دیکھئے تو خود یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی:-

شب کہ تھا بزم میں ہنگامۂ صد ناز و نیاز — حسن اُدھر مہر برخ عشق اِدھر سینہ گداز

تھا یہ مکتب پیر مغاں ہے درس عرفانی — رہے گا تا بہ کے سرمست حکمت ہائے یونانی

دید آساں ابھی اے موسیٰ عمراں ہو جائے — خط اگر برق تجلی کا رگ جاں ہو جائے

عزیز نے تشبیب میں حسن و عشق، بہار، رندی و مستی، مناظر فطرت اخلاق اور علم کے مضامین نظم کئے ہیں۔ عشقیہ مضامین میں عاشق و معشوق کے درمیان مکالمہ، حسن و عشق کا موازنہ، معشوق کا سراپا، حسینوں کا ذکر

عشق کی سختیاں وغیرہ پیش کی ہیں، یہ ساری باتیں سرسری یا سپاٹ نہیں ہیں۔ بڑی معنویت کے ساتھ اُن کے رازہائے سربستہ کو فاش کیا گیا ہے۔ عزیز کا تصورِ حسن و عشق بہت بلند ہے۔ وہ حسن حقیقی اور عشق سرمدی کے قائل ہیں۔ وہ حُسن و عشق میں اک اتحادِ معنوی ثابت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عزیز نے تشبیب میں حسن و عشق کو بڑے حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے[۱]

غبار اس کا ابھی تک ڈھونڈھتا پھرتا ہے لیلیٰ کو
الٰہی کیا تعلق تھا دلِ مجنوں کو لیلےٰ سے

وہ محوِ بیخودی تھے دیکھتے کچھ ہوش ہی کب تھا
عبث ہے پرسش اندازِ حسنِ یار موسیٰ سے

بہار آنے پہ جب کوئی کلی کھلتی ہے لالے کی
شکستِ قلب مجنوں کی صدا آتی ہے صحرا سے

جمال شاہد وحدت نے باندھا ہے ہوا ایسی
اُڑا جاتا ہے دل بن بن کے ہر اک ذرہ صحرا سے

ہے حسن و عشق میں اک اتحادِ معنوی باہم
بر آمد دونوں یہ گوہر ہوئے ہیں ایک دریا سے

مجھے اس بحرِ عشقِ سرمدی کا ایک قطرہ دے
کہ جس نے انبیا کے چشمۂ دل میں جگہ پائی

بوقتِ ذبحِ اسمٰعیل جس نے دلدہی کی تھی
خلیل اللہ کو دے دے کے تعلیم شکیبائی

یہی تھا باعثِ چاکِ قمیصِ حضرتِ یوسف
اسی نے تھی گواہی پاکدامانی پہ دلوائی

بھلا یوں بے ستوں کیا تیشۂ فرہاد سے کٹتا
اسی نے بازوؤں میں کوہکن کے دی توانائی

اسی کی ہر رگِ دل تھی زمامِ ناقۂ لیلےٰ
یہی تو نجد میں تھا رہ نوردِ دشتِ رسوائی

عشقیہ اشعار کے پہلو بہ پہلو بہاریہ اور رندانہ شعر بھی ملتے ہیں۔ ان میں محاکات اور مضمون آفرینی کی کارفرمائی ہے۔ مبالغہ کا کام حسنِ تعلیل سے لیا گیا ہے۔ مبالغہ بھی استعمال کیا ہے مگر اس طرح نہیں کہ صرف طائرِ فکر

---

[۱] از صحیفۂ ولا" ص۲۹ اور ص۳۰

کی طاقتِ پرواز دکھانا منظور رہا ہو اور بس، مناظرِ فطرت کی تصویر کشی بھی خوب کی ہے۔ مثلاً

بہارِ برشگال آئی کہاں ہے ساقیٔ مہرو ۔۔۔ جگا دے آج کی شب تو ذرا چلتا ہوا جادو
گھٹائیں ہر طرف امڈی ہوئی برسات کی راتیں ۔۔۔ معاذ اللہ پھر اس پر دل اسیرِ حلقۂ گیسو
برستا ہے لگاتار آج پانی بھر گئے جل تھل ۔۔۔ ستم ہے اب بھی پیمانہ ہمارا اگر نہ ہو مملو
بہار آ آ کے جوشِ باطنی کو تیز کرتی ہے ۔۔۔ مری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں متصل آنسو
نویدِ فصلِ گل سے ہو گئیں رنجیں طرب آگیں ۔۔۔ رگوں میں خونِ تازہ دوڑنے پھرنے لگا ہر سو

(از صحیفۂ ولا ص ۹۴)

اظہارِ تموزِ موسمِ گرما دیکھئے:۔

دیکھئے تو نفسِ گرم کی آتش خیزی ۔۔۔ مثلِ شعلہ کے زباں کو ہے دہن میں حرکت
تپ رہا ہے صفتِ تختۂ سِل گرمی سے ۔۔۔ اک ذرا چرخِ مقرنس کی تو دیکھو رنگت
جاتے ہیں آتشِ یاقوت کے شعلے تا چرخ ۔۔۔ تفتگی سے یہ معادن کے ہوئی کیفیت
بسکہ ہر جسم دہکتا ہے بسانِ اخگر ۔۔۔ جوہرِ روح اڑا جاتا ہے سیماب صفت
سایہ ہر شخص کا تیزی حرارت سے سیاہ ۔۔۔ شعلہ خیزی سے ہر اک جسم میں جوشِ حمرت

(از صحیفۂ ولا صفحہ ۱۶۱)

اخلاقی عنصر کی مثال کے لئے "انقلابِ ہستی" (قصیدہ در منقبت امام حسنؑ) سے کچھ شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ بے ثباتیٔ عالم پر روشنی ڈالتے ہوئے تربیتِ نفس اور معرفتِ الٰہی کی تلقین کی ہے ؎

ہوشیار و باخبر اے سرخوشِ عہدِ شباب ۔۔۔ تا کجا نظارۂ نیرنگیٔ دار الخراب
کیا بساطِ خاک پر بستر نہ ہوگا ایک دن ۔۔۔ میں نے مانا تو ہے زیرِ خیمۂ زریں طناب
تیرا اس کی ایک منزل ایک بستر ہوگا کل ۔۔۔ کیوں فقیروں سے ہے اے منعم تجھے آج اجتناب

خود پرستی سرکشی غفلت رعونت حرص و آز　　نفس کو صحبت سے ان کی چاہیئے ہے اجتناب

عزیز کے ممدوحین ہی وہ تھے جو اخلاق حسنہ کا پیکر تھے۔ اس عنصر کو عزیز کس طرح اپنی فطرت کے خلاف پسِ پشت ڈال سکتے تھے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ اگر کوئی حالی کے انداز اور ان کے طور و طریقہ پر اخلاقی درس نہیں دیتا ہے تو وہ تنگ نظر اور خود غرض ہے۔ ادریس احمد ادیب لکھتے ہیں:۔

> حالی نے عہدِ حاضر میں قصیدے سے اصلاحِ سماج کا کام لینا چاہا تھا مگر عزیز نے اس مقصد کو پسِ پشت ڈال کر محض.... اپنی نجات کو پیشِ نظر رکھا۔ ایسی حالت میں اگر یہ کہہ دیا جائے کہ عزیز نے قصیدوں میں تنگ نظری یا خود غرضی کو جگہ دی تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔[1]

ادیب کا خیال کہاں تک درست ہے اس کا فیصلہ ناظرین مندرجہ بالا اشعار دیکھ کر خود کر سکتے ہیں، ڈاکٹر ابو محمد سحر[2] اور ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی[3] نے اپنا فیصلہ لکھ بھی دیا ہے اور دونوں قصائد عزیز میں اخلاقی عنصر پاتے ہیں۔ زخمی کا خیال تو یہاں تک ہے کہ عزیز نے قصیدے کے پردے میں اخلاقی کتاب پیش کی ہے۔

اگر عزیز کی تشبیب میں علمی مضامین دیکھنا ہوں تو "شمع حرم" یا "برق تجلی" دیکھئے۔ قصیدہ "شمع حرم" میں مذاہبِ عالم کے علماء جمع کیے گئے ہیں پھر مکالمہ اور مناظرے کے ذریعہ مذاہب کے تصورات اور علمی نکات و اصطلاحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "برق تجلی" میں تصوف و معرفت کی تعلیم دیتے ہیں فلسفہ

---

[1] تنقیدیں ص۶۰

[2] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ص۲۶۶

[3] اردو میں قصیدہ نگاری ص۲۳۰

کے ملحدانہ خیالات کی تردید کرتے ہیں۔ اقبال کی طرح وہ بھی علم پر معرفت کو اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً

نصاب مکتبِ پیرِ مغاں ہے درسِ عرفانی — رہے گا تابکے سرمست حکمتہائے یونانی
خمارِ بادۂ اشراق میں انگڑائیاں کب تک — کہاں تک اب یہ افلاطون کے خم کی نگہبانی
کہاں تک اب یہ پابندیٔ معقولات لایعقل — کہاں تک مجلسِ سقراط کی اب حلقہ جنبانی
تماشائے طبیعیات کا کب تک اثر دل میں — کرے گا صفحۂ بقراط کی کب تک نگہبانی
کہے گا آسماں کو دیکھ کر حدِ نظر کب تک — بدیہیات سے انکار کب تک وائے نادانی
تری تحقیق کے صدقے محقق واہ کیا کہنا — ہوا ہے رفتہ رفتہ منکرِ توحید ربانی
الٰہیات کے پڑھنے سے اے غافل نتیجہ کیا — نہیں ہے دل ترا جب جلوہ گاہِ نورِ عرفانی
کتاب النفس افلاطون اگر پڑھ لی تو کیا حاصل — حقیقت نفسِ امّارہ کی جب اپنے نہ پہچانی
دمِ لغزش یہ بیضائے دل سے بے خود اک — نہیں ہے دل ترا جب جلوہ گاہِ نورِ عرفانی
فنافی العشق ہو جا جب کہیں یہ عقدہ حل ہوگا — ترا ما فی الضمیرِ نفس ہے وہ رازِ پنہانی

(از صحیفۂ ولا صفحہ ۵۰ تک)

مضامین کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ تشبیب میں کہیں سے بے ربطی نہیں آنے پاتی۔ خیالات کی کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے جس سے گریز، مدح اور دعائیہ تک ایک تسلسل قائم رہتا ہے۔

تشبیب کے بعد گریز کی منزل آتی ہے۔ اس منزل کی مشکلات کا اندازہ شاعر ہی کرسکتا ہے۔ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سحر لکھتے ہیں:

> "یہ حصہ تشبیب اور مدح کے زبردست اجزا میں ربط پیدا کرتا ہے۔
> گریز کا سب سے بڑا حسن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تشبیب کہتے کہتے شاعر
> مدح کی طرف اس طرح گھوم جائے جیسے بات میں بات پیدا ہو گئی

ہو گریز کی یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ قصیدہ کا مہتم بالشان حصہ اور شاعر کے کمال کا معیار سمجھا جاتا ہے[1]

گریز کی نزاکت اور حسن اپنی جگہ پر ہے لیکن یہ تشبیب اور مدح کے ہم پلہ نہیں۔ کلیم الدین احمد کا بھی یہی خیال ہے کہ:۔

"گریز میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ ہاں دلچسپی اس قدر ہے کہ شاعر حسن و خوبی کے ساتھ کسی عاشقانہ مضمون یا کسی منظر کے بعد مدح کا آغاز کرتا ہے"[2]

عزیز نے گریز کو بدمزہ تو نہیں ہونے دیا مگر ضرورت سے زیادہ زور بھی نہیں صرف کیا ہے۔ "چراغ کعبہ" میں عزیز تشبیب کے بعد فرماتے ہیں ؎

ساقی ادھر بھی جام کہ ہے دورِ دورِ عشق	بیٹھا ہوں عزم کوچۂ جاناں کیے ہوئے
سنگِ حرم سے کعبہ ہوا سر بہر داغ	دل میں کسی کے عشق کو پنہاں کیے ہوئے
دکھلا رہی ہے جوششِ سودائے عاشقی	دیوارِ کعبہ چاک گریباں کیے ہوئے
ہاں اے نگاہِ شوق یہ کون آ رہا ہے دیکھ	اک چاند اپنی گود میں پنہاں کیے ہوئے

(از صحیفۂ ولا صنہ ۱۰۱)

اس کے بعد حضرت علیؓ کی مدح شروع ہو جاتی ہے اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں حسن و عشق کا مکالمہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی گریز قابلِ داد ہے ؎

عزیز اللہ جانے کیا ہوا ہم نے تو یہ دیکھا	اٹھا کر عشق کو خلوت میں لائے کچھ تماشائی

---

[1] اردو میں قصیدہ نگاری صنہ ۲۰

[2] اردو شاعری پر ایک نظر صنہ ۲۳۲

ہوا جب غلغلہ تجویز چند ارباب شوریٰ میں	یمانی اک کسا اُس مستِ رعنائی نے بھجوائی
ہوا جب کچھ افاقہ آہ کھینچی دل سے اک ایسی	در و دیوار پر صورت محمد کی نظر آئی
کہا یہ عشق نے بڑھ کر کہ اے سر دفتر عالم	ازل سے منتظر تھا آج صورت تم نے دکھلائی

(از صحیفۂ ولاصت)

گریز کے بعد مدح شروع ہوتی ہے۔ اس حصہ پر شاعر اپنا سارا علم و فضل اور فنی کمال دکھا دیتا ہے۔ تشبیب اور گریز کا وجود بھی اسی حصہ کے لئے ہوا ہے۔ اگر مدح کمزور رہ گئی تو تشبیب اور گریز کی آن بان بے معنی ہو جاتی ہے مدح کے دو جزو ہوتے ہیں (۱) غائب (۲) حاضر۔ مدح غائب میں شاعر ممدوح کے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے اور جائزہ لیتا ہے پھر مدح حاضر یعنی براہ راست ممدوح کی مدح شروع کر دیتا ہے۔ مدحِ غائب و حاضر پر سودا کا شعر ہے ؎

رو برو مطلع ثانی سے یہ عقدہ ہو حل	مدحِ غائب سے کھلے اس کے نہ مداح کا دل

عزیز نے مدح کے دونوں اجزا سے فائدہ اٹھایا ہے جس طرح تشبیب بلند ہے اسی طرح مدح بھی زوردار ہے۔ تشبیب اور مدح میں کون زیادہ بلند ہے اس کی تمیز کرنا مشکل ہے جب کبھی دو چیزیں آپس میں مماثلت رکھتی ہیں تو ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا بہت دشوار ہوتا ہے اور نتیجہ میں اختلافاتِ نقد و نظر راہ پاتے ہیں۔ مثلاً عزیز کے قصیدے اور غزلیں دونوں بلند ہیں۔ آغا اشہر[1] عزیز کو سلطانِ قصیدہ کہتے ہیں تو محمود[2] انہی کے نزدیک وہ اصل میں غزل گو شاعر تھے، ڈاکٹر ابواللیث[3] دونوں اصناف پر عزیز کی قادرالکلامی کے قائل ہیں۔ اسی طرح ادیس احمد ادیب کو عزیز کے قصیدہ،

---

[1] رسالۂ ادب دسمبر ۳۵ء (محمود آباد نمبر)

[2] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ صفحہ ۲۶۲

[3] لکھنؤ کا دبستانِ شاعری صفحہ ۸۱

میں مدح زیادہ بلند معلوم ہوتی تو ڈاکٹر سحر کو تشبیب۔ اویس احمد لکھتے ہیں:۔

"عزیز نے اپنے قصائد میں جو تشبیب پیش کی ہے وہ اس قدر اعلیٰ نہیں جتنی کہ مدح"[1]

ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:۔

گریز اور مدح کے اجزا عزیز کے یہاں کمزور نہیں ہیں۔ لیکن انھوں نے تشبیب پر زیادہ زور صرف کیا ہے"[2]

سودا اور کچھ دوسرے قصیدہ گویوں نے ممدوح کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف کی ہے لیکن عزیز کے یہاں نمایاں طور پر ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں اور اگر کہیں اُس کی جھلک دکھائی بھی پڑ جاتی ہے تو کوئی خاص کیفیت یا خوبی کی حامل نہیں ہوتی ہے مثلاً

جب اس نے تیغ حیدری نکال لی نیام سے ۔۔۔ نہ رک سکی کبھی کسی ملک کی رگ تمام سے

قصیدہ کی آخری منزل دعائیہ کی ہے۔ عزیز قصیدہ کے اختتام پر چند اشعار دعائیہ کے لکھتے ہیں اس میں اپنی ذات یا قوم کے لئے دعائیں کرتے ہیں، کبھی اپنی عاجزی اور انکساری ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی مدح کا حق ادا نہ ہونے سے طلبگار معافی ہوتے ہیں۔ کبھی قائد ملت کے لئے دعا کرتے ہیں مثلاً ؎

خدا ہے تیرا معترف رسول تیرے جاں نثار ۔۔۔ ادا ہو حقِ مدح کیا غلام کے غلام سے

---

[1] تنقیدیں صفحہ ۶

[2] اردو میں قصیدہ نگاری صفحہ ۲۴۱

ناخدائی کا ہے ہنگام کہ برباد ہے قوم
یا حسین ابن علیؑ ڈوب رہا ہے یہ جہاز

ہے عزیز سخن آرا بھی ترا حلقہ بگوش
اس طرف بھی نظر اے دوش محمد کے سوار

جز اک اللہ عزیز نکتہ پرور کیا قصیدہ ہے
ہر اک مضموں ہے الہامی ہر اک شعر عدیم الثانی

صلے میں اس قصیدے کے بجز اس کے نہیں خواہش
ہمارے حجت الاسلام کی ہو عمر طولانی

مجموعی حیثیت سے عزیز کے قصیدے مذہبی عقائد کے مظہر ہیں۔ قصیدہ کے ضوابط اور مقاصد کی پابندی کی ہے۔ عزیز نہ سودا اور ذوق سے متاثر ہیں اور نہ آزاد اور حالی سے، نہ انھوں نے بزرگان دین کے علاوہ کسی کی شان میں قصیدے لکھے اور نہ مشکل زمینیں اپنائیں۔ اخلاقی موضوعات پر الگ سے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ وہ نظم طباطبائی سے بھی زیادہ متاثر نہیں ہیں کہ اسلامی غزوات پر قصیدہ لکھتے۔ وہ اپنے علمی ماحول اور مذہبی عقائد کی بنائی ہوئی راہ اختیار کرتے ہیں۔

عزیز کی قصیدہ گوئی میں بھی خامیاں نکالی گئیں۔ اس کا جواب عزیز نے تو نہ دیا مگر ان کے احباب سے نہ رہا گیا۔ سارے اعتراضات اور انکے جوابات لکھنا تو طول عمل ہے البتہ ایک خاکہ پیش کر دینا مناسب ہے۔

یگانہ چنگیزی کی نکتہ چینیاں

جناب یاس یگانہ چنگیزی نے شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز میں عزیز کی دھجیاں اسی طرح اڑائی ہیں جیسے غالب شکن میں غالب کی۔ انھوں نے لکھنؤ کے کسی شاعر کو نہیں بخشا لیکن عزیز پر خاص طور سے نگاہ غضب رہی۔ اب اعتراضات ملاحظہ فرمائیں۔ (یہ اعتراضات و جوابات "شہرت کاذبہ" سے منقول ہیں۔

جما ہی آئی پھولوں کو ادھر ذکر صراحی سے
ادھر کھینچوں نے شاخوں پر ہر اک پیرا ہنی چٹکائی

پھولوں کو جماہی آنا یعنی چہ۔ بند کلی کو جماہی تو ٹھیک تھا کہ ذکر صراحی سے

بند کلی کھل کر پھول ہو گئی۔ کھلے ہوئے منھ سے جماہی لینا کیسے ممکن ہے"

ناطق لکھنوی کا جواب:۔ صائب کا شعر ہے ؎

غفلت نہ کنم در خم آں طرف کلاہ است	خمیازۂ گل وقتِ سحر بے سبب نیست

اعتراض:۔ ہر کلی ایک ہی بار چٹکتی ہے۔ دوبارہ نہیں چٹکتی، ہر ایک پور کے معنی یہ ہوئے کہ ایک کلی کئی بار چٹکی

جواب:۔ تشبیہ میں تین چیزوں کا ہونا لازم ہے۔ مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہہ مثلاً گل کو مشبہ اور ہاتھ کو مشبہ بہ ٹھہرایا جائے تو وجہ شبہہ حرکت، صورت، یا جوڑ، شد میں شید آاور صائب کا شعر ؎

چو دست از آستیں بیروں کنی گلدستہ را ماند	کف دستِ گل است غنچہ ساں سرہائے انگشتاں
ہمچو دستِ غنچہ صائب باگرہ یاں ساختند	اہلِ دل چوں ناامید از دامنِ مطلب شدند
وہ سستی ڈالنا تجھ پر مرا انگڑائیاں لے کر	نہیں بھولے گا اے بالیں پرست خواب تنہائی

اعتراض:۔ لکھنؤ کا محاورہ "سستی اتارنا ہے سستی ڈالنا نہیں"۔

جواب:۔ منشی سید محمد اسمٰعیل صاحب منیر شکوہ آبادی کا شعر ہے ؎

کوئی سستی کسی پہ ڈالتی تھی	کوئی انگڑائی لے کے ٹالتی تھی

یگانہ کا اعتراف" اب آپ نے ایک ایسا جواب دیا جو جواب کہا جا سکتا ہے اگر یہ شعر منیر شکوہ آبادی صاحب کا ہے تو بیشک ماننا پڑے گا۔

یگانہ کے اعتراض کا جواب انھیں کے قول سے دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"ایک جاہل بھی سمجھ سکتا ہے کہ غلبۂ محبت یا عداوت کی حالت میں جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں"[1]

---

[1] شہرت کاذبہ ص ۲۸

اکبر الہ آبادی کے یہ کہنے پر کہ "شہید جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط" جناب یگانہ نے مندرجہ بالا رائے قائم کی ہے۔ بات قابل قدر ہے۔ ادبی تنقید کو کبھی محبت یا عداوت کے تحت نہیں ہونا چاہیئے۔ اکبر کا فیصلہ محبت کے زیر اثر ہے اور یگانہ کے اعتراض عداوت کے تحت ہیں۔ لہٰذا "شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز" میں جتنے اعتراض کیے گئے ان پر بھی اسی پس منظر میں غور کرنا ہوگا۔ اس کتاب کے ہر جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کو عزیز سے عداوت تھی۔ مثال کے لئے یگانہ کے دو تین جملے ملاحظہ فرمائیں:-

"اس شخص کو نہ حفظ مراتب کا خیال ہے نہ بات کہنے کی تمیز۔ جو منہ میں آتا ہے بک جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایسے بے تکے شاعر کو گولی نہ ماردی جائے"

"میاں ذلیل لکھنوی کی طرح اور بھی بہتیرے شعراء نے یکہ میں شہرت کاذبہ حاصل کرلی ہے۔"

"میاں عزیز سے یہ امید رکھنا فضول ہے کہ وہ سمجھ کر بامعنی شعر کہتے ہیں۔"

مانی جائسی اور نقاد بدایونی کے اعتراضات پر اثر لکھنوی سے معرکہ آرائی:-

عزیز کے کلام پر یگانہ نے جو تنقید کی ہے وہ منصفانہ نہیں ہے۔ اسی لئے اعتراض کے صرف دو ہی تین نمونے نقل کئے گئے ہیں۔ یگانہ کے علاوہ ماہنامہ تسنیم (آگرہ) میں بھی عزیز کے کلام پر کچھ اعتراض کئے گئے۔ بات یہ ہوئی کہ تسنیم بابت مئی ۱۹۳۲ء میں عزیز کے "صحیفۂ ولا" پر اثر لکھنوی کا ایک مضمون نکلا۔ اس میں اثر نے عزیز کے کچھ اشعار کی تشریح پیش

کی۔ اسی پر مخالفت کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا حوالہ دیتے ہوئے اثر لکھتے ہیں:۔

"استاذی حضرت عزیز لکھنوی مدظلہ کے ایک قصیدے پر میں نے تبصرہ لکھا۔ مخالفت کا طوفان اٹھا میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہر نکتہ چیں کو جواب دوں۔ اسی وجہ سے تہیہ کیا تھا کہ خاموشی اختیار کروں۔ دیکھنے والے دیکھ لیں گے کہ شرح مطالب و توضیح معانی میں (بقول حضرت مانی) جذبۂ حق گذاری کو دخل ہے یا صرف حقیقت کا اظہار ہے مگر جناب قاضی غلام امیر صاحب امیر نقاد بدایونی نے اپنے مضمون میں جو ستمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے مجھے دو ایک جگہ براہ راست مخاطب کیا ہے اور کئی باتیں سخن گسترانہ آپڑی ہیں لہٰذا جواب کی جرأت کرتا ہوں"[۱]

نظر بچر کر تو دیکھو منتظر سب پینے والے ہیں رمد آلودہ آنکھیں سرخ صہبا کے پیالے ہیں

اعتراض:۔ ..... اثر صاحب سرخ کو صہبا کی صفت بیان فرماتے ہیں۔ گو اساتذۂ ماسبق کے یہاں صہبا کا مفروضہ رنگ سرخ ہے مگر صہبا کے لغوی معنی صرف شراب کے ہیں۔ کسی بیتدی کا شعر ہوتا تو لفظ سرخ کے بیکار اضافے سے درگذر کی جا سکتی تھی۔ عزیز صاحب کے مطلع میں بجائے صہبا کے سرخ صہبا یقیناً قابل تعجب ہے[۲]

(در باغ چوں بیادِ تو صہبا زدیم ما گل را چو پنبہ برسرِ مینا زدیم ما)[۵]

---

[۱] ماہنامہ تنسیم (آگرہ) بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ء صلا

[۲] تنسیم (آگرہ) بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء صلا

جواب:- میں حیران ہوں کہ ایک ذمہ دار شخصیت نے ایسے اعتراض کو کیوں کر جائز رکھا۔ شراب کا مفروضہ رنگ سرخ سہی تاہم مستند اساتذہ نے اس کا اظہار کیا ہے اور گلفام، گلگوں، گلرنگ وغیرہ کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب کسی شے میں مختلف صفتیں پائی جاتی ہیں تو حسبِ موقع جنھیں نمایاں کرنا ہوتا ہے بیان کر دیتے ہیں تاکہ خیال دوسری صفتوں کی طرف بھٹکتا نہ پھرے خواہ وہ صفت بدیہی ہو شراب ہی کو لیجیے! اگر اس کے رنگ کی طرف توجہ دلانا ہے تو سرخ ارغوانی، گلابی وغیرہ لاتے ہیں، اگر اس کی کیفیت یا تاثر کو نمایاں کرنا ہو تو سرجوش، دو آتشہ، تند اور نہ معلوم کیا کیا کہتے ہیں۔ اعتراض کا ضعف اساتذہ کے کلام کی مثالوں سے بھی ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو کہ شراب کے بیان میں اُس کے رنگ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہر جگہ یہ اضافہ آرٹ کی تکمیل میں معاون ہوا ہے اور تصویر کی رعنائی دوبالا کرتا ہے۔ میر تقی میرؔ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

میرؔ:- عجیب ہے اگر میرے آوے میسر ۔۔۔ گلابی شراب اور غزل اپنے ڈھب کی

قاآنی:- بنیش و بیار خندہ شیریں ۔۔۔ برخیز و بیار بادۂ حمرا

ایضاً:- بکف لیلے زسرخ مے کہ گراز چکد تے ۔۔۔ ہمی ز بند بند رگ برش جہد شرارہا

لاعلم:- چیست دانی؟ بادۂ گلگوں مصفا جوہرے ۔۔۔ عشق را پروردگارے حسن را پیغمبرے[1]

اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں جو ہمارے روزمرہ میں داخل ہیں، مثلاً نیلا آسمان چمکتا ہوا ستارہ، مہرِ منور، حسن دلکش سنگ سخت

---

[1] ماہنامہ تسنیم (آگرہ) بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۴۴

وغیرہ ایسے بہت سے اضافے ہیں جن سے درگذر کی جا سکتی تھی۔ مگر اضافے اظہار کو موثر دلکش اور واضح بناتے ہیں۔ چاہے یہ کلام کا ایک ضروری عیب (NECESSARY EVIL) ہی کیوں نہ ہو مگر اس سے درگزر مشکل ہے۔

اعتراض: عزیز صاحب نے غالباً رمد کے معنی سرخیٔ چشم فرض کر لئے ہیں اور اُن کے خیال میں رمد کے اندر لزوماً سرخی کا مفہوم موجود ہے۔ ہم اثر صاحب کے اطمینانِ خاطر کے لئے۔ بہار عجم جس پر اُنھیں اعتماد ہے رمد کے معنی دکھاتے ہیں۔ رمد۔ درد چشم و درد کردن چشم۔ اس میں وہ درد بھی شامل ہے جو سرخی کی وجہ سے ہو لیکن لفظ رمد سے لزوماً سرخی کی طرف خیال منتقل نہیں ہو سکتا جب تک کوئی مزید تشریح نہ ہو۔[1]

جواب:۔ "لغت میں کچھ ہو مگر عام طور پر رمدِ چشم کا مفہوم آنکھیں دکھنا ہے جس میں درد۔ کھٹک، سرخی اور تمام علامتیں آنکھیں دکھنے کی شامل ہیں۔ شاعر کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر میں چاہوں کہ فاضل معترض کی عبارت ہی سے جواب نکل آئے تو عرض کر سکتا ہوں کہ جب رمد کے لئے سرخیٔ چشم لازم نہیں ہے تو سرخی کی طرف انتقال خیال کے واسطے صہبا کے ساتھ سرخ کا اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ علاوہ بر ایں شعر میں رمد آلود آنکھیں ہیں اور بحث صرف رمدِ چشم سے کی جاتی ہے۔ رمد کے ساتھ لفظ آلود کا اضافہ ذہن کو بے اختیار سرخیٔ چشم

---

[1] :۔ ماہنامہ تسنیم (آگرہ) بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء ص ۱۷

کی طرف متبادر کرتا ہے نہ کہ درد کی طرف ... یہ ارشاد کہ رمد آلود
آنکھوں سے نظر بھر کر دیکھنے کی التجا تکلیف مالا یطاق ہے اور اس میں
دلکشی کا پتہ نہیں اپنے اپنے مذاق اور اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے[1]"

اسی طرح اعتراض اور ردِ اعتراض کی یہ بحث ستائیس شعروں پر مشتمل ہے۔ مانی جائسی اور ایک گمنام ناقد نے بھی اعتراض کیے ہیں جو موماً بالا اعتراضات کے طرز پر ہیں۔ کچھ اعتراضات معقول بھی ہیں۔ مثلاً ایک قصیدے میں عزیز اردو کے شعر لکھتے لکھتے فارسی پر اتر آئے اور مسلسل پچیس شعر کہتے چلے گئے۔ بیچ بیچ میں عربی کے فقرے اور مصرعے بھی آجاتے ہیں۔ مگر قصیدہ میں اس قسم کی جید الاستعدادی اور ادق گوئی جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ قصیدے اُس محفل میں پڑھے جاتے تھے جہاں عربی، اور فارسی کا رواج زیادہ تھا۔ عربی اور فارسی کے شعروں میں اردو کی روانی پیدا کرنا اور انھیں اردو اشعار کے ساتھ بے تکلف نظم کر دینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا، ایسے شعروں سے لطفِ محفل دونا ہو جاتا تھا۔ اگر عزیز نے اس قسم کے شعر کہے تو اُس میں اُن کا قصور نہیں ہے اس لئے کہ اس عہد میں اس طرح کے اشعار بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

عہد عزیز کے جتنے مشہور و مستند اساتذہ تھے اُن میں زیادہ تعداد عزیز کے استادوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں کی تھی۔ یہ بات حسّاد برداشت نہ کر سکے اور اعتراضات کی بارش سے حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے[2]۔ آثر لکھنوی لکھتے ہیں :-

---

[1] ماہنامہ تسنیم (آگرہ) بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ء ص ۴۵

[2] عبدالماجد دریابادی کہتے ہیں "عزیز صاحب کی ادبی دنیا کی شہرت بعضوں کے لئے مخالفت کا سبب بن گئی" (۲۸ نومبر ۵۷ء کو بروقت ملاقات مولانا کا بیان)

"عزیز صاحب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ لکھنؤ کے مشہور شاعر ہیں ورنہ روح القدس کے ہمصفیر مانے جاتے۔ لکھنؤ کا شاعر اگر کوئی نشاط انگیز شعر کہتا ہے تو اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ ہنوز "محو حسنِ لبِ بام" ہے وہی بات کوئی غیر لکھنوی کہتا ہے تو شبہہ ہوتا ہے کہ حافظ کی روح اُس میں بول رہی ہے اور بڑا پہونچا ہوا ولی ہے۔ لکھنوی شاعر کوئی تحسر آمیز شعر کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ غزل کو مرثیت یا قنوطیت سے کیا کام۔ اس کو روح کا "رقصِ رنگیں" ہونا چاہیے۔ غیر لکھنوی وہی دکھڑا روتا ہے تو "دنیا سیاست کے ماہر" کا خطاب پاتا ہے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔[1]"

عزیز کے قصائد اگر ان کے ماحول اور اُن کے عقائد کی روشنی میں دیکھے جائیں تو ایک گراں بہا سرمایہ ثابت ہوں گے قصیدوں کی تعداد بھی اگر کسی شمار میں ہے تو عزیز سب سے آگے ہیں یہی خیال ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی کا بھی ہے اور نسیم امروہوی کا بھی۔

عزیز کی قصیدہ نگاری پر اپنے خیالات ظاہر کرنے والوں میں سے چند ناقدین کی رائیں حسب ذیل ہیں:-

عزیز کی قصیدہ نگاری پر دانشوروں کے تاثرات:- پروفیسر آغا اشہر:-

"اردو کے موجودہ زمانہ کے قصیدے اگر فن کے کانٹے پر میزان کئے جائیں تو عزیز مرحوم کے قصائد والا پلہ گراں ملے گا ... وجہ کمال قصیدہ یہ تھی کہ صحبت علماء کی برکت سے مرحوم لکھنؤ میں آنے والے اہل علم ایرانیوں کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ اُن میں ایک بزرگ علامہ سید احمد استرآبادی

---

[1] ماہنامہ تسنیم بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۸

تھے۔ ایک مرتبہ عزیز نے فارسی کا ایک قصیدہ ان کو سنایا۔ بہت تعریف کی اور اشعارِ ذیل مدحاً لکھ دیئے ؎

لطفِ شورش در تغزل وجد آرد در روح را | سوزشِ نظمش مگر سوزندہ و لہا بود
شعرِ او در ہر زباں اردو بود یا فارسی | ہر یک از اشعارِ او یک گوہرِ یکتا بود،،[1]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :۔

" آخر دور کی قصیدہ گوئی نے فن کے اعتبار سے شہرت نہ پائی۔ عزیز نے قصائد کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے اور چونکہ یہ قصائد تمام رسولِ اکرم اور اہلِ بیت کی شان میں ہیں اس لئے قصیدے درباری رنگ سے محفوظ اور خلوص عقیدت پر مبنی ہیں۔ اس لئے اُن کو اس نقطۂ نظر سے پرکھنا درست نہ ہوگا جس سے عام قصائد پرکھے جاتے ہیں،،[2]

ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی :۔

" عزیز لکھنوی بیسویں صدی کے ربع اول کے سب سے بڑے قصیدہ نگار ہیں ان کے قصیدوں میں قدما، متوسطین اور متاخرین کے رجحانات کی مجموعی جھلک ملتی ہے۔۔ وہ قصیدے کے پردے میں اخلاقی کتاب پیش کرتے ہیں۔۔ عزیز کے یہاں مجموعی طور پر گریز اچھی نہیں ملتی۔ مگر چند گریزوں میں وہ نزاکتِ تخییل کا ایسا نادر نمونہ پیش کرتے ہیں کہ سودا اور آسیر کی گریزوں کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں،،[3]

نسیم امروہوی :۔

قصیدہ گوئی میں آپ دورِ جدید کے ذوق یا سودا کہلانے کے مستحق ہیں،،[4][5]

---

[1] رسالۂ ادب (محمود آباد نمبر) دسمبر ۱۹۳۵ء

[2] لکھنؤ کا دبستان شاعری صہ ۸۰۵

[3] اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ (ایک تحقیقی مقالہ جس پر علی گڑھ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی)، صہ ۲۵۹ سے صہ ۲۶۷ [4] نظمِ اردو ضمیمہ نمبر ۲ صہ ۲۴

اویس احمد ادیب:۔

عزیز نے مدح کے اشعار بہت بلند کہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت علی اور شہدائے کربلا کی مدح کا حق ادا کر دیا ہے اور وہ تمام خوبیاں بیان کی ہیں جو انمیں موجود تھیں[1]

ڈاکٹر ابو محمد سحر:۔

"عزیز کافی پر گو قصیدہ نگار ہیں[2] عزیز کے قصیدے بنیادی طور پر روایت سے وابستہ ہونے کے باوجود جدت اور اختراع کا ایک بے نظیر نمونہ ہیں۔ سب سے اہم جدت جو عزیز کے قصیدوں میں دکھائی دیتی ہے اور جو کثرت استعمال کی وجہ سے ان کا مخصوص رنگ بن گئی ہے وہ تغزل کی آمیزش ہے۔ اردو میں قصائد کی روایت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تغزل اُس کی کمزوری سمجھی گئی ہے لیکن عزیز نے تغزل کو قصیدے کے آہنگ میں اکثر و بیشتر اس طرح سمو دیا ہے کہ یہی ان کا امتیازی کارنامہ بن گیا ہے[3] عزیز نے عاشقانہ مضامین کی طرح رندانہ مضامین کو بھی قصیدوں میں مختلف طریقوں سے شامل کیا ہے۔ اکثر رندانہ اشعار انھوں نے ساقی نامہ کے انداز میں لکھے ہیں[4] عزیز نے بعض قصیدوں کی تشبیب میں اخلاقی اور علمی مضامین بھی نظم کئے ہیں[5]۔"

---

[1] تنقیدیں ص ۶۳

[2] اردو میں قصیدہ نگاری ص ۲۳۴

[3] 〃 〃 〃 ص ۲۳۵

[4] 〃 〃 〃 ص ۲۳۷

[5] ایضاً ص ۲۳۸

عزیز صرف غزلوں اور قصیدوں تک ہی محدود نہیں رہے ۔ ان دونوں اصناف کو بقدرِ ذوق نہ پاکر اپنے بیان کو کچھ اور وسعت دینا چاہی۔ اپنے معاصرین اکبر، اقبال، جوش، صفی اور ظریف کی طرح عزیز بھی نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔

عہدِ جدید سے پہلے نظم کو پوری طرح پھولنے پھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ شاعری وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے طوفان نے ہندوستانی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نئے مسائل پیدا ہوئے۔ اسوقت نظم ایک تحریک کی صورت میں ابھری جس کی قیادت آزاد اور حالی نے کی ۱۸۶۷ء میں انجمن پنجاب کا ایک جلسہ ہوا جس میں نظم اور کلامِ موزوں پر محمد حسین آزاد نے ایک پُر مغز تقریر کی اسی تقریر سے نظم کی تحریک کا آغاز ہوا ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب

کا جو مشاعرہ ہوا اُس میں مصرعہ طرح نہیں دیا گیا بلکہ موضوعات دے گئے شعرا کی توجہ کا مرکز ردیف وقافیہ اور بحر نہیں رہے۔ یہ توجہ موضوعات پر مرکوز ہو گئی۔ ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کے مشاعرے میں جو نظمیں پڑھی گئیں ان میں سماج کی بدلتی ہوئی حالت تعمیر نو کی خواہش اور بہتر مستقبل کی تلاش کے نقوش موجود ہیں۔ آزاد اور حالی کی کوششوں کو اسمٰعیل۔ شبلی، اکبر، نادر کاکوروی اور سرور جہاں آبادی نے آگے بڑھایا اب تک کی اگر تمام نظموں کا جائزہ لیا جائے تو اُس کی صورتیں غزل قصیدہ ہجو، مرثیہ، قطعہ، مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسمط، ترکیب بند وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اگر موضوعات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سیاسی، سماجی اخلاقی، مذہبی، عشقیہ، فلسفیانہ، حزنیہ، طربیہ اور قومی نظمیں سامنے آتی ہیں مناظر فطرت کی تصویر کشی بھی نظموں میں کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ نظم ہر صنفِ سخن اور ہر موضوعِ حیات پر محیط ہے۔ تعمیری پہلو، سماجی موضوعات، انسان دوستی اور فکر و نظر کی وسعت یہ سارے عناصر اپنے شاعرانہ حسن کے ساتھ نظم میں جلوہ گر ہیں۔

اکبر اور سرور جہان آبادی جیسے سال خوردہ شعراء کے ساتھ ساتھ پنڈت کیفی، چکبست، اقبال، شوق قدوائی، صفی، ظفر علی خاں۔ جوش اور عزیز لکھنوی جیسے خردسال شعرا بھی علم نظم گوئی کو بلند کر رہے تھے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

> "پنڈت کیفی۔ چکبست، اقبال، شوق قدوائی، صفی لکھنوی، ظفر علی خاں وغیرہ نے نظم گوئی کا علم کچھ اس طرح بلند کیا کہ زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلو شاعری میں جگہ پا گئے... سوئے ہوئے جذبات

جاگے۔ دبے ہوئے جذبے ابھرے محدود تصورات کی حدیں وسیع ہوئیں۔ ان شعراء کے یہاں ماضی کی مرثیہ خوانی کے ساتھ حال کا خیر مقدم اور مستقبل کی امید دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ قومی تصورات ہی نہیں بین الاقوامی سوجھ بوجھ بھی پیدا ہو چکی تھی۔ انداز نظر سیاسی کم اور اخلاقی زیادہ تھا۔ اس عہد میں موضوعات کے تنوع اور وسعت کے باوجود جو باتیں بالکل نمایاں ہو کر متوجہ کرتی ہیں وہ قومی اور سیاسی، وطنی اور ملکی زندگی سے متعلق ہیں جب ہم اس جذبے کے اظہار میں اختلاف پائیں گے تو بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکیں گے کہ شاعروں کی مختلف سوجھ بوجھ کی بنا پر ان کی انفرادیت کس طرح نمایاں ہو جاتی ہے"[1]

متذکرہ بالا مشہور نظم نگاروں کی طرح عزیزؔ نے بھی سوئے ہوئے جذبات جگائے ہیں۔ دبے ہوئے جذبے ابھارے ہیں۔ ماضی کی مرثیہ خوانی سے انھوں نے بھی حال کی اصلاح اور مستقبل کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ عزیزؔ کا بھی اندازِ نظر سیاسی کم اور اخلاقی زیادہ ہے۔ عزیزؔ بھی پھیلتی ہوئی مغربیت سے بہت پریشان اور فکر مند ہیں اور اندیشہائے دور دراز میں مبتلا ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سوجھ بوجھ کے وافر نقوش عزیزؔ کی نظموں میں موجود ہیں۔ عزیزؔ کا قومی درد وہی ہے جو اکبرؔ اور اقبالؔ کا ہے۔ قوم کے بین الاقوامی انتشار سے عزیزؔ بھی اقبالؔ کی طرح متاثر نظر آتے ہیں مگر فرق اندازِ فکر اور طریقۂ اظہار کا ہے۔ اپنے شعور، تجربہ اور وسعتِ نظر کی بنا پر شاعر کے

---

[1] نگار (ماہنامہ لکھنؤ) جنوری فروری ۱۹۵۷ء ص ۱۳۶

یہاں مسائلِ حیات کے متعلق فیصلے انفرادی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اکبر اکبر ہیں اقبال اقبال ہیں اور عزیز عزیز ہیں۔

عزیز کی نظموں کو اگر بلحاظ ہیئت دیکھا جائے تو شاعری کی تقریباً سبھی صورتوں میں عزیز کی نظمیں ملیں گی اور اگر بلحاظ موضوع دیکھا جائے تو قوم، مذہب، مناظرِ فطرت، سیاست، فلسفہ، اخلاق، معاشرت، بین الاقوامیت حزن اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات ملیں گے۔

عزیز کی نظموں کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کچھ ایسی نظمیں ہیں جن میں بزرگانِ قوم کی بہادری، اخلاق، عظمت، عزت اور جوانمردی کے کارناموں کو یاد دلا کر نیک عملی کی ترغیب دی ہے اور جوانانِ قوم کی بے عملی، افسردگی اور غفلت پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ مثلاً نظم "عروج و زوال" میں کہتے ہیں:۔

سلاطین اولوالعزم ایک دن محکوم تھے میرے
رکھا تھا سر پہ میرے اک مرصع تاجِ سرداری

ہلا ڈالا تھا میں نے جا کے اک دن قصرِ قیصر کو
فلسطین اور روما تک تھی میری ہی عملداری

مگر اک وقت وہ آیا ہے اب اے اہلِ دل سن لو
کہ مجھ کو دوسری قوموں میں حاصل ہے نگونساری

نہ ہم میں اتفاق اب ہے نہ اسبابِ ترقی ہیں
نہ ذوقِ علم ہے دل میں نہ پاسِ دینِ دینداری

ترقی کر رہی ہیں دوسری قومیں زمانہ میں
ہمارے دشتِ ہمت میں کھنچی ہے چار دیواری

نظم "نالۂ محشر طراز" میں فرقہ بندی اور آپسی جھگڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

ہم اخوانِ یوسف کی طرح ہیں خون کے پیاسے
نفاق و کبر نے وہ آگ اس گھر میں لگائی ہے

ایک نظم "یاد دہی" جو امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک قومی جلسہ میں پڑھی گئی۔ قوم سے خطاب کرتے ہیں ؎

اتحادی جوش پیدا کرکے ہم آواز ہو پھر ترقی کے لگا کر مائل پرواز ہو
ہر ریزولیوشن کو کرلو پاس کیا دشوار ہے جب عمل اس پر نہیں ہوتا تو سب بیکار ہے

یہ چند اشعار بطور مثال پیش کیے گئے[1] اسی قسم کے خیالات "یاد ایام" "یادگار سلف"، "ایک آنہ فنڈ"، "نالۂ خونچکاں" اور "عہد ماضی" (عنوانات نظم) میں بھی ظاہر کیے ہیں۔

کچھ نظمیں وہ ہیں جن کا تعلق قومی مدرسوں اور اداروں سے ہے۔ اُس وقت تعلیمی تنظیم کی جو تحریکیں چلائی جاتی تھیں اُن میں عزیز بھی اپنی پُراثر نظموں سے جوش و ولولہ پیدا کر دیتے تھے۔ ان نظموں میں افرادِ قوم کے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہِ راست پر لانے کے جذبہ کا اظہار ہے۔ یہ نظمیں شیعہ کالج اسلامیہ یونیورسٹی، طبیہ کالج، ندوۃ العلماء اور مدرسۂ مشارع الشرائع (مدرسہ ناظمیہ) سے متعلق ہیں۔ یہ سب نظمیں عزیز کی مطبوعہ تصنیف "نالۂ حزیں" میں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں غیر مطبوعہ نسخہ "سبع گل" میں ہیں جو مدرسۂ تکمیل الطب، مدرسۂ منبع الطب اور مدرستہ الواعظین کے لئے کہی گئی ہیں۔ نظم "اسلامی یونیورسٹی" میں کہتے ہیں:

مرکزی قوت دکھائیں قوم کے اہلِ دول تاکہ پھر اسلام کی معراج ہو ضرب المثل
قلزمِ فیض و کرم اب اپنا دھارا تیز کر چشمۂ ہمت ذرا ہاں جوش میں آکر اُبل

انگریزوں کی حکومت اپنے ساتھ ایسے علوم لیکر آئی جو ہماری درسگاہوں کے نصاب میں نہیں تھے لیکن وقت کا تقاضہ تھا کہ انھیں داخلِ نصاب کیا جائے سید سلیمان ندوی نے اس پر کافی زور دیا۔ نظم "شیعہ کالج" میں عزیز اس طرف

---

[1] تعمیر حیات لکھنؤ ص ۲ (ندوۃ العلماء کا رسالہ)

بھی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً۔

ملیں گے تعلیم مذہبی سے یوں ہی علوم جدید کالج
معانقہ کر رہے ہیں جیسے دخورِ جوشِ طرب میں مومن

اسی خیال کو نظم "جذبۂ دل" میں بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم ندوۃ العلماء کے سترھویں اجلاس میں علامہ شبلی کی پُر مغز تقریر کے بعد پڑھی گئی" [1]

دریا کے ہم ان دونوں دھاروں کو ملا دیں گے
ہو فلسفۂ مغرب یا فلسفۂ مشرق

عزیز کی قومی نظموں میں مختلف قسم کے لب و لہجے ملتے ہیں۔ ایک نظم [2] مدرسہ تکمیل الطب کے جلسہ میں عزیز نے پڑھی جس میں عارفانہ واعظانہ اور موثر خانہ انداز ملتے ہیں، ہر رنگ کا ایک ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔ دیکھئے شعروں میں بھرپور شعریت بھی موجود ہے ؎

عارفانہ: ختن کو نافہ چمن کو کلیاں عدن کو موتی سخن کو خوشبو
دمن کو لالہ سخن کو لذت صدف کو دُرِ یتیم بخشا

واعظانہ: یہ علم محتاج تجربہ ہے یہ فن طلبگار جد و کد ہے
عمل میں لازم ہے سعی کرنا فقط کتب پڑھنے سے کچھ نہ ہوگا

موثرانہ: ہمارے ہی علم و فن ہیں سب جو آج یورپ کے ہاتھ میں ہیں
وہ کام جس کا کہ لے رہے ہیں وہ ہیں ہمارے تمھارے اعضا

تیسری قسم اُن نظموں کی ہے جن میں انھوں نے یتیمانِ قوم کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے صاحبانِ کرم اور حضرات جود و سخا کو اُن کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یتیموں کے جذبات کی ترجمانی کچھ ایسے پُر اثر انداز میں کی کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو اور جیب سے پیسے نکل پڑے۔ ان نظموں کو دیکھ کر اگر عزیز کو مصورِ غم کا لقب دے دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ عزیز "نالۂ جرس" کو شروع ہی ایسے قطعہ سے کرتے ہیں جس سے ان کے دلِ دردمند کا

---

[1] نالۂ جرس ص۳۶

[2] سبدِ گل (غیر مطبوعہ)

پتہ چلتا ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو۔

اپنی بے مائگی پہ نادم ہوں ورنہ کرتا نذر گوہر تقسیم
اشک بن کر کبھی جو ٹپکے تھے نذر ایتام ہیں وہ دُرِ یتیم

قومی شاعر کا ایک فرض اصلاح قوم ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر عزیز کی نظموں کو دیکھا جائے تو اُن کی اصلاحی کوششیں ہر نظم میں ملیں گی۔ حکومت مغرب کے زیر نگیں قوم کی معاشرتی اور اخلاقی تنزلی سے اپنے ہمعصر نظم نگاروں کی طرح عزیز بھی بہت متاثر تھے۔ مثلاً نظم "ہماری ہستی" میں قوم کے جمود اور بے علمی پر روشنی ڈالنے کے بعد اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے اس سلسلہ میں بہت سے اشعار ہیں جن میں سے مثالاً کچھ شعر درج ذیل ہیں ؎

تخم نفاق بونا ہرگز نہ اس چمن میں اس نخل سے ثمر کا کرنا نہ تم نظارا
وہ قصرِ اتحادی ہرگز نہ تم گرانا خونِ وفا سے کل تک جس کا بنا تھا گارا

نظم "نئی روشنی کا اسلام" میں مغرب کی اندھی تقلید سے دین کی تباہی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ؎

جانتے ہیں معتبر ہم تارِ برقی کی خبر یہ حدیثیں کیا ہیں یہ قرآن کیسا الہام کیا
عنصرِ مذہب مسلمانوں میں باقی ہی نہیں ہند کیا ایران کیا، ٹرکی و روم و شام کیا

مرثیہ "عصمت بی بی" میں بڑھتی ہوئی بے پردگی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اکبر اور اقبال کی طرح عزیز نے بھی عورتوں کی آزادی اور بے پردگی کی مذمت کی ہے۔ عزیز نے ایک خاتون سے اُن کی بے پردگی کا سبب پوچھا تو خاتون نے جواب دیا ؎

کہا اس نے یہ مجھ سے بادیدۂ تر کہ جب سے یہ آئے ہیں لندن سے پڑھ کر
کیا مجھ کو مجبور بے پردگی پر نکالا مجھے ساتھ ساتھ اپنے باہر

"ایفائے وعدہ" میں صادق الوعد ہونے کی نصیحت فرماتے ہیں، جیسے

مردہ سخن زباں سے نہ ہرگز کہا کرو ہے روح اُس کلام میں جس پر عمل کرو

"اسرارِ فطرت" میں وعظ و پند کا لب و لہجہ دیکھئے اقبالؔ سے کتنا ملتا ہوا ہے ؎

نہیں ہوتا نشانِ یوسفِ بے کارواں پیدا کنویں جھانکے نہ جب تک جستجوئے شوق میں کوئی
مگر گلشن میں کم ہوں گے گلوں کے رازداں پیدا تماشا دیکھنے والی تو یوں ساری خدائی ہے
مگر ہوتے ہیں مشکل سے چمن میں باغباں پیدا بقدرِ ذوق یوں تو ہے ہر اک کو ذوقِ گلچینی

ان نظموں کے علاوہ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن سے عزیزؔ کی فلسفیانہ بصیرت اور تفکرانہ گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے "حیات و ممات"، "فلسفۂ حسن"، "شاعری"، "صبحِ پیری"، "جوانی"، "ارسطو کے فلسفیانہ خیالات" وغیرہ۔ "حیات و ممات" ایک غیر مطبوعہ نسخہ میں موجود ہے، چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

زندگی کیا ہے؟ سایۂ خورشید موت کیا؟ ایک لذتِ جاوید
یہ ہے شیدِ تشخصِ موہوم وہ تماشائے عالمِ تجرید
زندگی کیا ہے؟ اک تلاطم ہے موت کیا ہے سکونِ جسمانی[1]

بقیہ نظمیں مختلف ماہناموں میں طبع ہو چکی ہیں جن کو مندرجہ ذیل حوالوں[2] میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو نظم آپ نے "شاعری" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس میں جوشؔ کا انداز جھلکتا ہے۔ اگر عزیزؔ، جوشؔ کے شاگرد ہوتے تو

---

[1] بیدِ گُل

[2] معیار لکھنؤ، فروری ۱۹۳۱ء (فلسفۂ حسن) معیار جنوری ۱۹۳۰ء (شاعری) معیار فروری ۱۹۳۰ء (صبحِ پیری) زمانہ کانپور مارچ ۱۹۱۱ء (جوانی) معیار اکتوبر ۱۹۱۱ء (ارسطو کے فلسفیانہ خیالات)

کہہ دیا جاتا کہ استاد کی پیروی کی ہے مگر یہاں تو معاملہ الٹا ہے۔ یہ نظم چھتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ تین شعر بطور نمونہ مندرجہ ذیل ہیں ؎

شاعری کیا ہے؟ فقط اک جذبۂ لطف و خروش ۔۔۔ قوتِ تخییل میں اک ولولہ انگیز جوش
شاعری کیا ہے فقط؟ تصویرِ جذباتِ نہاں ۔۔۔ قوتِ تخییل کے ہمراہ تاثیرِ زباں
ساغرِ جذباتِ باطن میں جب آ جائے ابال ۔۔۔ دل کے سرچشمہ میں جب پیدا ہو جوشِ انفعال

عزیز مذہبی عقائد میں بہت پختہ تھے۔ انھوں نے مذہبی نظمیں لکھیں ہیں جن کے عنوانات نیچے لکھے جاتے ہیں:۔

("توحید" "یوم العاشور" "مناظرہ سنی شیعہ" "تعمیر اسلام" "جلسۂ بیت المال" "روزۂ حلیم" "تعمیر درگاہ حضرت عباس[1]" اور "کلام مجید" "آوازۂ تکبیر" "نومسلموں کی حالت" "شمعِ مزار" "گلِ مزار[2]" "عید قرباں" "تشنہ لب بچے" "یہ حسرت داد" "فریاد از غربتی دبے یارئ حسین" "عزائے حسین" "مساوات[3]" اور "شمعِ عزاخانہ[4]" وغیرہ)

عزیز کو تعزیتی اور رثائیہ نظمیں کہنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مثلاً "خسارہ مختصر پر ایک آنسو" اور "گریۂ خویش[5]" یا "مرثیہ علامہ بلگرامی" اور "مرثیہ مرزا محمد عباس[6]" وغیرہ نظموں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۹ء

---

[1] یہ نظمیں نسخۂ غیر مطبوعہ "سبدِ گل" میں ہیں۔
[2] یہ نظمیں "نادجرس" میں طبع ہوئی ہیں۔
[3] یہ نظمیں ہفت روزہ "سرفراز" لکھنؤ کے شماروں میں شائع ہوئیں۔
[4] ماہنامہ "فرات" بابت ماہ فروری ۱۹۲۱ء
[5] یہ دونوں نظمیں "سبد گل" میں لکھی ہوئی ہیں۔
[6] یہ دونوں نظمیں لکھنؤ کے رسالہ معیار جنوری اور اکتوبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئیں۔

کہ ایک حادثہ سے متاثر ہو کر نظم "رخسارۂ مختصر پر ایک آنسو" لکھی گئی۔ ایک حسین و نازک اندام لڑکی نہایت خاموشی سے بستر مرگ پر دم توڑ رہی ہے۔ نزع کے وقت ایک آنسو اُس کی آنکھ سے نکلتا ہے۔ اسی ایک آنسو پر عزیز نے اپنے تاثرات مسدس کے نو بندوں میں نظم کئے ہیں۔ ہر بند برجستگی، آمد تاثر، دل کشی کی بہترین مثال ہے اور جذبات کی سچی تصویر ہے۔ پوری نظم دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ "گریۂ خونیں" دراصل ایک مرثیہ ہے جو عزیز نے اپنی پانچ سال کی دختر سعیدہ خاتون کے انتقال پر لکھا ہے۔ نظم کا ہر شعر باپ کے دکھے ہوئے دل کا آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں متعدد اشعار ہیں۔ ذیل میں صرف دو شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

ایسی پیاری صورت اور پیوند خاک کا پیوند ہو	اس قدر بے رحم تجھ کو اے قضا ہونا نہ تھا
فرطِ الفت میں بلائیں تو نے لیں اکثر مری	فرض یہ میرا تھا تجھ کو یوں فدا ہونا نہ تھا

ایک نظم میں میر تقی میر کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نظم میں چھبیس اشعار ہیں۔ اور اس کا عنوان ہے "میر"[1] اس نظم میں عزیز نے اپنے طائرِ فکر کی طاقتِ پرواز خوب خوب دکھلائی ہے۔ ہر شعر داد دینے کے لائق ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں :-

شاہدِ بزمِ سخن نا خوردۂ معنی طراز	اے خدائے ریختہ پیغمبرِ سوز و گداز
یوسفِ ملکِ معانی پیرِ کنعانِ سخن	ہے تری ہر بیت اہلِ درد کو بیت الحزن

عزیز نے طربیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً تہنیتِ شادی از جانب سید ابوالحسن رحمۂ شادی، سہرا مولانا سید محمد فرزند جناب مولانا سید باقر صاحب، نویدِ شادی

---

[1] معیار اپریل ۱۹۳۰ء صفحہ ۲۲

چودھری رحم علی الہاشمی، موہن لال کالی پرشاد خلف شیتلا پرشاد یہ سب نظمیں غیر مطبوعہ نسخہ "سبدِ گل" میں ہیں، ایک سہرا مولانا عبد الماجد دریابادی کے لیے کہا ہے۔ اس کا عنوان "نویدِ مسرت" ہے۔

عزیز نے عام موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں جیسے "اردو۔ اسکول کا گھنٹہ، الوداعیہ، لطیفہ ادبی، استاد، جلسہ امین آباد ہائی اسکول، رسالہ آئینہ اور خیر مقدم" وغیرہ۔ افسوس کہ یہ ساری کی ساری نظمیں ناظرین کے سامنے اب تک نہ آ سکیں اور "سبدِ گل" میں روپوش ہیں۔

عزیز کی وہ نظمیں بھی قابلِ قدر ہیں جن میں انھوں نے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی کی ہے۔ مثلاً لکھنؤ سے خطاب۔ "منظر کاشی"، "مئی کا چاند"، "طلوعِ خورشید"، "مئی کا جوان چاند" (ٹامس مور کی نظم سے مقتبس ہے) "موسم سرما" "شبِ ماہ"، "فوارہ"، اور "ابرِ نو بہار" وغیرہ۔ منظر کاشی کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس کی شانِ نزول ایڈیٹر معیار کے لفظوں میں درج کی جاتی ہے یہ۔

"۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو ہمارے لکھنؤ کے نامی گرامی نوجوان شاعر حضرت عزیز کو بغرض شرکت جلسۂ سالانہ انجمن تہذیب الاخلاق سکریٹری صاحب کے بے حد اور مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر بنارس جانا پڑا۔ منجملہ اور سب سامانِ دلچسپی کے فرودگاہ لبِ دریا تھی۔ یہ مکان کے اعلیٰ درجہ کی عمارت میں ہے اور پھر لبِ ساحل کرہ اُس پر شبِ ماہ۔ دریا کا کنارہ چھٹکی ہوئی چاندنی ایک خوبصورت

۱؎ الناظر ستمبر ۱۹۱۶ء

سجی ہوئی کوٹھی کا بالاخانہ، یہ دلکش مناظر عزیز جیسا شاعر دیکھے اور چپ رہے، جذبات دلی آخر نہ رک سکے اور ایک ترکیب بند کی صورت میں نظم ہوئے۔

اس نظم میں پانچ بند اور (۱۳+۱۰+۱۱+۹+۹) باون شعر ہیں پوری نظم لطف سے بھری ہوئی ہے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

جلوۂ معرفت ذات بڑھانے کے لئے — چاند گنگا میں اترتا ہے نہانے کے لئے
آگ لگ جائے نہ اسے دامن دریا تجھ میں — برق وش آتے ہیں کچھ پھول چڑھانے کے لئے
ناؤ کھیتے ہوئے ملاح چلے آتے ہیں — خبر رومیدِ دل پُرشوق بڑھانے کے لئے
سطح آب پہ ہے چادر مہتاب پڑی — شاہدانِ چمن آرا کو سلانے کے لئے

عزیز نے سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ملک کی عملی سیاست سے عزیز کوئی خاص تعلق تو نہیں رکھتے تھے مگر بیگانہ اگر وہ بیش بھی نہیں تھے وہ ایک شاعر کا دل و دماغ رکھتے تھے۔ اگر سیاسی موضوعات پر قلم نہ اٹھاتے تو ضرور تعجب ہوتا۔ مجاہدین آزادی وطن کی تعریف عزیز نے بھی اسی طرح کی ہے جس طرح دوسرے وطن پرست شعرائے ہند کے یہاں ملتی ہے۔ ملک کے مخلص دوست اور وطن پرست رہبر بال گنگادھر تلک کی وفات پر عزیز نے جو نظم لکھی ہے اس کا ایک شعر یہاں پر بطور نمونہ پیش ہے ؎

قوم کا ہے فرض اس کی یاد کو ہمدم کرے — جشن آزادی کرے ہر دم کرے پیہم کرے[1]

مہاتما گاندھی کے لکھنؤ آنے پر جو نظم عزیز نے لکھی اس کے اشعار بقول مہاراجکمار آف محمود آباد جناب امیر حیدر صاحب[2] اس مقولہ کی

---

[1] فروغ اردو لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۷

[2] ایضاً

تصدیق کرتے ہیں کہ شاعری جزویست از پیغمبری، عزیز نے اسی وقت اپنے فہم و فراست سے بھانپ لیا تھا کہ آج سے اٹھارہ سال بعد اسی قائد کے کہنے پر چل کر ہندوستان غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر رہے گا۔ اس نظم کے چند شعر پیش ہیں ؂

یہ عزت آج ہوئی لکھنؤ کو پھر حاصل ۔۔۔ کہ اس کے سینہ میں ہندوستاں کا ہے دل
وہ کون فخرِ زمانہ مہاتما گاندھی ۔۔۔ کہ جس نے قوم کی اصلاح پر کمر باندھی
جہاں میں خلق ہوا ہے جو رہبری کے لئے ۔۔۔ شفیق بن کے اٹھا بندہ پروری کے لئے
ہر ایک فرد اگر ہوگی تابعِ ارشاد ۔۔۔ کرے گا اپنے وطن کو وہ ایک دن آزاد
خبر نہیں تمہیں کیا رنگ لائے گا چرخہ ۔۔۔ تمہاری گردشِ قسمت مٹائے گا چرخہ
وطن کو فائدہ پہونچاؤ ہے یہی معراج ۔۔۔ یہی ہے راج یہی تاج اور یہی سوراج

"روزِ ورودِ محمد علی شوکت علی"، "واقعات حاضرہ"، "ترک موالات" "روزِ ورودِ پرنس آف ویلس" وغیرہ کے عنوانات پر عزیز نے سیاسی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جو عزیز کے عہد میں ہندوستان کی سیاست کے اہم موضوعات تھے۔ "روزِ ورودِ محمد علی شوکت علی" نظم رفاہِ عام کلب نذیر گنج لکھنؤ میں علی برادران کی آمد کے موقع پر تقریباً بیس ہزار افراد کے سامنے پڑھی گئی۔ "واقعاتِ حاضرہ" میں مسئلہ خلافت کی شورش اور رسو راجیہ کے طوفان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً گاندھی جی کی پُر اثر تقریروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؂

اُس طرف حضرت گاندھی کی خطابت آندھی ۔۔۔ دیکھ کر ہمت اقدام اُڑے جاتے ہیں ہوش

علی برادران کی قومی سرگرمی کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؂

قوت افزائے دلِ قوم ہے ذم الاخوین[1] ۔۔۔ نسخۂ عشق میں ہے روح یہ جزوِ پُرجوش

---

[1] ایک دوا کا نام بھی ہے۔

جوش ملیح آبادی کی سیاسی دلچسپی کو بیان فرماتے ہیں ؎

جوش بھی حلقۂ پیر دن در اس بزم میں ہے
ہوس گرمی ہنگامہ میں سرگرم خروش

کچھ اہلِ وطن تو خلافت اور سوراجیہ (स्वराज्य) کے لئے سخت بلاؤں میں پھنسے ہوئے تھے اور کچھ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ عیش پرستوں کی طرف روئے سخن دیکھئے ؎

ان میں کیا خاک کوئی ہوگا پرستارِ وطن
رات دن بسترِ غفلت پہ ہے خوابِ خرگوش

بروزِ ورودِ پرنس آف ویلس لوگوں کو بادلِ ناخواستہ بھی پرنس کی زیارت کے لئے جانا پڑا یہ حقیقت عزیز نے بے دھڑک اپنے شعر میں ظاہر کر دی۔ دیکھئے مصلحتِ وقت اور حب الوطنی نیز لوگوں کے ظاہر و باطن کی سچی تصویر کس طرح عزیز پیش کرتے ہیں ؎

دل تو گاندھی جی کا ہے اور پاؤں ہیں سرکار کے
پا بہ جولاں جا رہے ہیں شوق میں دیدار کے

عزیز کی نظریں صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ تھیں۔ وہ دنیائے اسلام کی قسمت کا ستارہ گردش میں دیکھ رہے تھے۔ بلقان، طرابلس، ایران اور مشہدِ مقدس پر دشمنوں کے حملے ہو رہے تھے۔ اقبال کی طرح عزیز نے بھی اپنی نظموں میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ نظمیں نالۂ دلگداز، مشہد کا عبرت انگیز نظارہ، ایران، مشہد مقدس اور خون کے آنسو عنوانات کے تحت "نادر جرس" میں شائع ہو چکی ہیں اور ادب نوازوں کو دعوتِ نظر دے رہی ہیں۔ ان نظموں کے اندر اتنا اثر ہے کہ ناظرین کے دلوں سے آہ اور زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔ مہاراجکمار صاحب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:۔

"عزیز کے دل شکستہ کی آواز توپوں کی گونج اور گرج سے زیادہ با اثر انداز میں سنائی دی تھی"[۱]

---

[۱] فروغ اردو (لکھنؤ) جنوری فروری ۱۹۶۹ء ص ۱۳

ان نظموں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی طرح عزیز کی نظریں بھی تاریخ عالم پر تھیں اور وہ بھی کرۂ ارض پر ہونے والے حادثات و واقعات کا بغور مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً مشہدِ مقدس کا عبرت انگیز نظارہ" میں فرماتے ہیں ؎

تجھ کو یورپ یاد ہے تاریخ اپنے دور کی — قتل کر ڈالا گیا تھا چین میں اک پادری
ایک طوفاں تھا زمیں سب زلزلے میں تھی پڑی — آج ہے اُس جوشِ اخلاقی میں کیوں اتنی کمی
دائرہ شائستگی کا جبکہ اتنا عام تھا — کس لئے پھانسی پہ پھر اک حجت الاسلام تھا

بالآخر "حقیقت مُنتظرہ" سے "لباسِ مجاز" میں نظر آنے کی درخواست کرتے ہیں ؎

سننے والا دردِ دل کا ہے نہ کوئی نوحہ گر — دل اُدھر بیکار ہے ڈوبی ہوئی نبضیں اِدھر
اب تو سب آثارِ روزِ حشر ہیں پیشِ نظر — کیجئے جلدی ظہور اے حجتِ ثانی عشر
یہ تغافل بھی نہیں شایانِ بندہ پروری — کام کس دن آئے گی اب ذوالفقارِ حیدری

اسلامی فرقے جو آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور دامنِ اسلام کو داغدار بناتے ہیں انھیں اتحاد کا سبق بھی دیا جاتا ہے ؎

آپسی جھگڑوں کو چھوڑے قوم کب تک یہ عناد — اتحاد الاتحاد الاتحاد الاتحاد

عزیز کی نظموں میں سیاسی اور سماجی عناصر کے وافر نقوش دیکھنے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ڈاکٹر رفیق حسین نے یہ کیسے لکھ دیا کہ:-

"عزیز نے تو سیاسی اور سماجی قدروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔"[1]

عزیز کی نظم نگاری کے مجموعی جائزے کے لئے مہاراجکمار امیر حیدر صاحب کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا:-

"یہ زمانہ وہ تھا کہ جب اودھ کے شاہی تمدن کا زوال ہندوستان کے جذبۂ آزادی کا عروج، مشرقی اور مغربی علوم کا ٹکراؤ، قوم کی از سرِ نو شیرازہ بندی کے تقاضے

---

[1] الہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین ۱۹۵۵ء ص۱۰

تعلیمی اداروں کی اٹھتی ہوئی تحریکیں، بین الاقوامی سیاست کی نیرنگیاں اور بالآخر پہلی جنگ جرمن کے دور رس اثرات ایک حساس دل، ایک ہمدرد طبیعت اور ایک عالم باعمل کو خدمتِ قومی کی جانب متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے قومی نظم کا وہ جادہ، جو مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس سے کھولا۔ جسمیں اکبر الہ آبادی اپنے مخصوص طنزیہ اور مزاحیہ رنگ میں منفرد حیثیت پیدا کر گئے اور جسمیں اقبال جیسا عمیق فکر فلسفی مضبوط بنیادوں پر ایک تلمیح تعمیر کر گیا جسمیں صفی کے ایسا استاد بے بدل نئی روح پھونک گیا، کوئی آسان منزل نہ تھی لیکن عزیز کی لیاقتِ علمی، استعدادِ فطری، صلاحیتِ طبع اور سچے جذبۂ قومی کا یہی ثبوت کافی ہے کہ انھوں نے بھی اس میدان میں ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو سینۂ انسان کی تہ میں جاگزیں ہو کر بیساختہ دل سے داد اور زبان سے فریاد حاصل کر لیتے ہیں۔[1]

عزیز کی نظمیں دیکھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف غزل اور قصیدہ ہی کے شاعر نہیں تھے بلکہ ایک اچھے نظم نگار بھی تھے۔ معیاری نظموں کے سارے محاسن ان کے یہاں موجود ہیں، زبان کی سلاست و روانی، تراکیب محاورات کی بہ جستگی، طرزِ ادا کی دلکشی، شاعرانہ صنعت گری، حقیقت نگاری اور زورِ بیان سے مضامین نظم کو بہت ہی جاندار بنا دیا گیا ہے۔ عزیز کی نظمیں تاثر کی بہترین مثالیں ہیں۔ ایک ایک نظم پر ہزار ہزار روپیے بصورتِ عطیہ برائے یتیم خانہ افرادِ قوم سے حاصل ہوئے اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عزیز کی نظمیں افادی پہلو سے بھی ہمکنار تھیں۔

---

[1] فروغ اردو (لکھنؤ) جنوری فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ۶

نوحہ، رُباعی، سلام اور مرثیہ[1]

عزیز نے نوحہ، رُباعی، سلام اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چند نمونے صحیفۂ وِلا میں موجود ہیں۔ قادر الکلام شاعر تھے ہی۔ جس صنف کو چاہا اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ مگر نہ اُن میں کوئی خاص رنگ پیدا کیا اور نہ اپنی شاعری کا کوئی بڑا کارنامہ سمجھا۔ رباعیوں میں اہلبیت کی مدح کی گئی ہے۔ زبان آسان اور پُر شکوہ ہے۔ انیس کا رنگ جھلکتا ہے۔ مثال:-

تفسیر کتابِ دیں پناہی تو ہے — زینت دہِ تختِ بادشاہی تو ہے
واللہ کہ اے شہیدِ دشتِ غربت — مجموعۂ اخلاقِ الٰہی تو ہے

عزیز نے کچھ سلام بھی لکھے ہیں جو واقعات کربلا سے متعلق ہیں۔ انھیں واقعات کے ضمن میں اخلاقی درس بھی دیے گئے ہیں۔ ان سلاموں کے

---

[1] گلِ تابوت (سلام اور نوحوں کا مجموعہ جو طبع ہو چکا ہے)

ذریعہ اہل بیت کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ایک سلام[1] کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

شہیدِ اعظم و فخرِ امم سلام علیک	غریب کشتۂ تیغ ستم سلام علیک
فروغِ دودۂ ختمی مآب نورِ اللہ	نجستہ شاہ جمیل الشیم سلام علیک

مرثیہ نگاری میں عزیز نے رنگِ انیس اپنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر انیس کی طرح باقاعدہ اجزائے معینہ کے ساتھ کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ عزیز فطرتاً مرثیہ نگاری کی طرف راغب نہیں تھے۔ صرف دوستوں کے اصرار پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں مرثیہ سے مراد اُس حزنیہ نظم سے ہے جو بشکل مسدس شہدائے کربلا کے حالات پر مشتمل ہو۔ مرثیہ کے جتنے بھی بند عزیز نے کہے ہیں ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انھوں نے باقاعدہ مرثیہ کہا ہوتا تو آج معیاری مرثیہ نگاروں کے ساتھ اُن کا بھی نام لیا جاتا۔ ایک مرثیہ "درسِ وفا" کے نام سے "صحیفۂ ولا" میں درج ہے۔ اس مرثیہ میں اصحابِ حسینؑ کے بلند کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً ان کی شجاعت اور ثابت قدمی اس طرح نظم کرتے ہیں ؎

وہ رعب و جلالت کہ ہر اک دیکھ کے ششدر	شیرانہ نظر ڈالی تو تتر بتر ہو لشکر
تھے رزم میں اس بات سے بے خوف دلاور	موت ان پہ گرے یا وہ گریں موت پہ جا کر
تیغ اس پہ لگائی تو کبھی اس کی سپر لی	ڈوبے صفِ اول میں تو آخر کی خبر لی

اردو شاعری میں اخلاقیات کی کمی تھی جس کو میر انیس نے اپنے

---

[1] الواعظ لکھنؤ جولائی اگست ۱۹۲۴ء

مرثیوں سے دور کر دیا۔ عزیزؔ نے بھی اخلاقی درس دیے ہیں۔ مثلاً ؎

ثابت کیا اس بات کو تم نے سرِ میداں | یہ قدرتِ انساں ہے یہ ہے عظمتِ انساں
شیرازۂ دل ہو نہ کسی وقت پریشاں | ثابت قدمی چاہیئے ہر کام ہے آساں
مرجاتے ہیں ہوتا ہے جنھیں پاسِ وفا کا | طے ہوتا ہے یوں مرحلہ تسلیم و رضا کا

تعریفِ اسلام نظم کرنے کے تیور دیکھئے ؎

گاڑا ہے نشاں جس کا پیمبر نے وہ اسلام | دی جس کو غذا حمزہؓ و جعفر نے وہ اسلام
آغوش میں پالا جسے حیدر نے وہ اسلام | سینچا ہے جسے خوں سے بہتر نے وہ اسلام
راحت اسے پہونچائی مگر ظلم سہے خود | اسلام کو آزاد رکھا قید رہے خود

عزیزؔ کی مرثیہ گوئی سے متعلق ایک واقعہ[1] یہ ہے کہ عزیزؔ کے ایک پُر خلوص دوست جناب مؤدب لکھنوی نے ایک مرتبہ اُن سے مرثیہ کہنے کی فرمائش کی۔ عزیزؔ نے فرمائش پوری کی اور جناب مؤدب سے سچی، منصفانہ اور بے لاگ داد کے طلبگار ہوئے، جناؔ مؤدب نے فرمایا کہ ایسا لگتا ہے جیسے گھر کی ملکہ کہیں چلی گئی ہیں اور کھانا آپ نے خود پکا لیا ہے۔ شاید اس تنقید کا مطلب یہ ہے کہ مرثیہ میں کہنہ مشقی اور پختگی بہت کم ہے۔

[1] زبانی باقر صاحب رنگینؔ

فرد نگاری

فرد بھی اک صنف شاعری ہے۔ مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں :۔

"فرد اور بیت میں یہ فرق ہے کہ فرد کسی سے تعلق نہیں رکھتا ایک تنہا شعر ہوتا ہے اور بیت کسی غزل یا قصیدہ، مثنوی وغیرہ کے ہر شعر کو کہہ سکتے ہیں لہٰذا بیت عام ہے اور فرد خاص ہے"[1]

عزیزؔ نے فرد نگاری بھی کی ہے اس میں انھوں نے سماجی، مذہبی اور سیاسی موضوعات نظم کئے ہیں یا جو بھی خیال اتفاقاً ذہن میں آ گیا نظم کر دیا زبان عام فہم ہے۔ فرد کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

مرے بعد تادیر ماتم رہے گا ۔۔۔ اگر میں نہ ہوں گا مرا غم رہے گا

اقبالؔ اپنے طرزِ سخن میں یگانہ ہے ۔۔۔ اکبرؔ حکیم و نبض شناسِ زمانہ ہے

دنیا کے مگر کوئی نہ معنی نکلے ۔۔۔ الٹے بہت اوراقِ کتابِ ہستی

منھ پھیر کے چل ایسے امیروں کی طرف سے ۔۔۔ جو نشۂ دولت میں کریں خواہش تسلیم

اک سانس تو تعدادِ معین سے بڑھا لے ۔۔۔ دعوے ہیں بہت پیر دُہ الحاد میں تجھ کو

دل کسی طرح مانتا ہی نہیں ۔۔۔ نیک و بد اپنا جانتا ہی نہیں

کیسا ہنگامہ ہے یا رب یہ کہاں آیا ہوں ۔۔۔ عالم ہستی میں آکر سخت گھبرایا ہوں میں

---

[1] آئینۂ بلاغت ص ۱۸

یہ فن بہت قدیم ہے۔ اس کی تخم ریزی اُسی وقت ہوئی جب عربوں نے یونانیوں[1] (GREEKS) کی طرح اپنے حروف کے عدد مقرر کئے پھر انھیں اعداد کے ذریعہ تاریخ نکالنے کا کام شروع ہوا۔ عربی سے یہ فن فارسی میں آیا اور فارسی سے اردو میں داخل ہوا۔ بنیادی طور پر اس فن کا مقصد کسی واقعہ یا سانحہ کے سالِ وقوع کو ذہن میں محفوظ رکھنا ہے۔ انسانی ذہن بالعموم ہندسوں کے یاد رکھنے میں غلطی کرتا ہے۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیئے دانشوروں نے ایک سہل ترکیب نکال لی اور تاریخ ایجاد ہو گئی۔ اس کا شمار صنائع و بدائع میں ہوتا ہے۔ ہر صنف میں تاریخ کہی جا سکتی ہے اور کہی جاتی ہے اس میں اور دیگر صنائع میں فرق یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق سماج میں پیش آنے والے

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۹۶

واقعات سے ہوتا ہے جبکہ دوسری صنعتوں کا استعمال ادبی اور تہذیبی ضرورتوں کے زیر اثر تو ہوتا ہے مگر کسی واقعہ کے لئے نہیں۔ اس حقیقت کو پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اس طرح واضح کرتے ہیں:۔

"اس موقع پر فن تاریخ گوئی کے ایک ایسے ضمنی محرک کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جو اُسے دوسرے صنائع سے جدا کرتا ہے۔ صنائع و بدائع کا استعمال تہذیبی حالات کے زیر اثر ضرور ہوتا ہے مگر کسی واقعہ کے لیے نہیں ہوتا ہے لیکن تاریخ کسی خاص واقعہ ہی کی نکالی جاتی ہے، اس لئے معاشرتی روابط تاریخ گوئی کے فن پر بے حد اثر انداز ہوتے ہیں۔"[۱]

معاشرہ کے واقعات ہی تاریخ کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ ولادت وفات، عطیۂ خطاب و خلعت یا انعام منصب و جاگیر۔ سلسلہ تعلیم کی بسم اللہ رسم ختنہ، شادی خانہ آبادی، غسل صحت، تخت نشینی، کسی عمارت کا سنگ بنیاد تکمیل اور افتتاح، کتاب کی طباعت اور جریدہ کی اشاعت وغیرہ کے ایسے تو ہزاروں مواقع زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ ان واقعات کا سالِ وقوع یاد رکھنے کے لئے تاریخوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ اردو میں دراصل اس کا رواج لکھنؤ میں زیادہ ہوا۔ دہلی میں مومن کے علاوہ کوئی بھی شاعر اس کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا۔ اسے عام کرنے اور مقبولیت بخشنے کا سہرا ناسخ اور ذکی مرادآبادی ایسے اساتذۂ فن کے سر ہے۔ آتش اس کی طرف غالباً

---

[۱] ناسخ صفحہ ۲۱۶

راغب نہیں ہوئے۔ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ نے اس قدر کثرت سے تاریخ گوئی کی کہ ہر شاعر گویا تاریخ کہنا اپنے لئے ضروری سمجھنے لگا۔ یہ رواج اتنے عظیم پیمانے پر پہنچا کہ انیسویں صدی میں جن کتابوں اور دواوین کی طباعت ہوئی ان میں شاید ہی کوئی تاریخ سے خالی ہو۔ اس فن کا استعمال قصیدوں کی طرح مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے بھی کیا گیا بلکہ تاریخ گوئی قصیدوں سے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوئی کیونکہ قصیدے صرف مسرت کے موقعوں تک ہی محدود ہیں اور تاریخ ہر موقع پر کام آتی ہے اس کا رواج بڑھتے بڑھتے ایک تفریحی مشغلہ بن گیا یہاں تک کہ کتے، بلی اور کبوتر کے لئے بھی تاریخیں کہی جانے لگیں۔ پھر بھی اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس فن میں افادیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی لکھتے ہیں :-

> "یہ انداز چاہے جس قدر فضول ہو مگر اس کا ایک فائدہ مند پہلو یہ تھا کہ آج بہت سے واقعات اور سوانح کے زمانۂ وقوع سے مطلع ہونے کا واحد ذریعہ یہی قطعات تاریخ ہیں۔ بلاشبہ تاریخ ادب اردو کی تدوین میں قطعاتِ تاریخ سے غیر معمولی استفادہ کیا گیا ہے اور آئندہ بھی تعین زمانہ کے لئے تاریخیں بہترین اور معتبر ذریعہ ثابت ہوں گی۔۔ قطعاتِ تاریخ گویا فنکاروں کا تحفہ ہیں جو وہ آئندہ آنے والے مورخین کے لئے چھوڑ گئے ہیں[1]۔

یہ فن ناسخ اور شاگردان ناسخ و آتش کے واسطے سے عزیز اور معاصرین

---

[1] ناسخ صنف ۲۲، ص ۲۳۱

عزیز تک پہنچا۔ ماحول کے اثرات اور اپنے پرخلوص تعلقات کی بنا پر عزیز اس عظیم اور تقرب بڑھانے والے فن کی طرف متوجہ ہوئے اور کثیر تعداد میں تاریخیں کہیں جو نہ صرف شہر لکھنؤ میں بلکہ بیرونِ شہر[1] بھی مسجدوں کی محرابوں اور مزاروں کے پتھروں پر کندہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عزیز کی تاریخیں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ تاریخوں کی اچھی خاصی تعداد محفوظ ہے جسے انشاءاللہ بہت جلد کتابی شکل میں پیش کروں گا۔ عزیز کی تاریخیں ولادت، وفات عطیۂ خطابات، شادی بیاہ، کتاب اور اخبار کی طباعت اور اشاعت، تقریب ختنہ، تعمیر عمارت کی تکمیل اور افتتاح سے متعلق ہیں۔ عام رواج کے مطابق بیشتر تاریخیں عزیز نے فارسی میں کہی ہیں۔ کچھ تاریخیں اردو میں بھی ملتی ہیں یہ تاریخیں بالعموم سالِ ہجری میں نکالی گئی ہیں۔ عیسوی سن کی تاریخیں ہیں تو مگر بہت کم۔

عزیز کی تاریخوں میں کہیں کہیں جدت بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ مثلاً حسب قاعدہ الف ممدودہ کا ایک عدد جوڑا جاتا ہے لیکن عزیز نے تاریخ کے زریں اصول (جیسا لکھو ویسا ہی حساب کرو) کے تحت حسبِ ضرورت برابر سے دو الف لکھ کر دو عدد محسوب کئے اور تاریخ نکال لی۔ مثلاً

گفتم ایں سالِ خانہ آبادی   بادہ اآباد خانہ احسرت

اسی طرح عزیز نے "ب" کو کبھی ہائے ہوز کے ساتھ لکھ[13] کر "بھ" ہے اور کہیں اسم میں براہ راست جوڑ دیا ہے۔ جیسے، بہ جنت یا بجنت، عزیز کو جہاں پر

---

[1] قصبہ جرول ضلع بہرائچ میں ایک نو تعمیر مسجد کی محراب پر عزیز کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

جیسی ضرورت ہوئی ویسا طریقہ اپنایا۔ مثلاً:۔

۱۔ سفت ایں گوہر یک دانہ تاریخ عزیزؔ — نجم تابندہ پسر منزل اعجاز شدہ
(ب، ہ والے ہمزہ کے ساتھ)

۲۔ عزیزؔ مصرعۂ سالِ اشاعتش بنوشت — نوید تازہ بہندیست کعبۂ مقصود
(ب، اسم کے ساتھ)

یہی طریقہ "است" کے لکھنے میں بھی اپنایا ہے۔ مثلاً کہیں "عقد ست"، لکھا ہے اور کہیں "عقد است"، ایک جگہ الف محسوب نہیں ہوا، ایک جگہ محسوب ہوا۔ ہمزہ اکثر لفظ کے آخر میں آتا ہے تو بعض لوگ اس کا ایک عدد محسوب کرتے ہیں۔ مگر عزیزؔ نے ہمزہ (ء) کا کوئی عدد محسوب نہیں کیا ہے۔

عزیزؔ نے تاریخی صنعتوں کو استعمال نہیں کیا، لہٰذا منقوطہ، مہملہ، تصحیف، توشیح، رعنا، در اور فوقانیہ وغیرہ سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے استعمال سے تاریخ کا جلد سمجھ میں آنا مشکل ہو جاتا ہے ہو سکتا ہے اسی وجہ سے عزیزؔ نے صنائع کی طرف کوئی توجہ نہ کی ہو۔

تاریخ کی تین انواع ہوتی ہیں:۔

۱۔ کامل الاعداد — نہ کوئی عدد کم ہوتا ہے نہ زیادہ

۲۔ زائد الاعداد — عدد زیادہ ہوتے ہیں جن کا تخرجہ ہوتا ہے۔

۳۔ ناقص الاعداد — عدد کم ہوتے ہیں اور تعمیہ کرنا پڑتا ہے

عزیزؔ کی جتنی تاریخیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں تین زائد الاعداد ہیں اور صرف ایک ناقص الاعداد ہے۔ زائد الاعداد تاریخوں میں عزیزؔ نے تخرجہ بھی بہت واضح طریقہ سے کیا ہے جس سے مادہ تاریخ کے سمجھنے میں زیادہ زحمت نہیں ہوتی۔ مثلاً سید مہدی حسن کو سلطنت برطانیہ سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ عزیزؔ نے قطعہ تاریخ کہا۔ آخری شعر حسب ذیل ہے:۔

مراد یار ندیدیم و عیاں شد تاریخ — وقعتِ خان بہادر، بوجودت نازد

۱۹۲۲ - ۱ = ۱۹۲۱

مادۂ تاریخ سے ۱۹۲۲ کا عدد نکلتا ہے۔ اِس سے ادبار کا سر یعنی "الف" کا ایک عدد کم کرنے سے مطلوبہ عدد ۱۹۲۱ نکل آتا ہے۔

ناقص الاعداد تاریخ (جو صرف ایک ہے) بھی بہت صاف رواں اور سلیس ہے۔ قطعہ حسبِ ذیل ہے:-

سید احمد حسن کلکٹر ما — زوجہ اش از جوارِ رحمت رفت
ہاتفِ غیب از سرِ اندوہ — گفت ایں مومنہ بجنت رفت

۱۳۳۷ + ۱ = ۱۳۳۸ھ

مادۂ تاریخ میں سرِ اندوہ یعنی "الف" کا ایک عدد تعمیہ کرنے سے ۱۳۳۸ ہجری کا سن نکل آتا ہے۔

عزیز کی بیشتر تاریخیں کامل الاعداد ہیں۔ ایسی تاریخیں کہنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔ یہی تاریخیں سب سے بہتر اور قابلِ داد سمجھی جاتی ہیں۔ خان بہادر سید مسعود حسن مسعود لکھتے ہیں:-

"پورے مصرع کا جس میں تعمیہ اور تخرجہ نہ ہو فنی اعتبار سے بہتر و کامیاب مادۂ تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ گوئی کا کمال یہ ہے کہ مادۂ تاریخ بے تکلف اور حشو سے پاک ہو[1]

عزیز کی تاریخیں برجستہ ہیں حشو و زوائد سے پاک ہیں اور متعلقہ شخصیت کے کسی نہ کسی روشن پہلو کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے عزیز کی تاریخ گوئی درجۂ کمال پر فائز تھی۔ مثلاً شیخ ممتاز حسین بیرسٹر نے بکثرت قومی خدمات انجام دی تھیں۔ عزیز نے تاریخِ وفات کہی جس میں یہ پہلو روشن کیا۔ مولانا سید علی جولو صاحب بنارسی کی تاریخِ وفات کہی جس سے ایک عالمِ دین کی شان ظاہر ہوتی ہے

---

[1] عندلیبِ تواریخ ص ۱۹

ملاحظہ فرمائیں ؎

ندرقم مصرعِ تاریخ عزیزؔ دلریش | نیرِ صبحِ ہدایت بہ زمیں شد لامع

آخر میں عزیزؔ کی تاریخ گوئی کے متعلق ایک واقعہ درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے عزیزؔ اپنے عہد کے بہترین تاریخ گو ثابت ہوتے ہیں واقعہ[1] یہ ہے کہ مولانا عین القضاۃ کے انتقال پر لکھنوی اور بیرونی شعراء کی ایک کثیر تعداد نے قطعاتِ تاریخ کہے۔ اُن تمام قطعات میں جو سب سے بہتر تھا اُسے منتخب کر کے سنگ مزار کی مسند پر جگہ دی گئی یہ قطعہ عزیزؔ ہی کا ہے جو آج بھی جامعہ فرقانیہ، فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ کے سنگِ مزار پر مزین ہے اور ناظرین سے دادِ تحسین لے رہا ہے اس تاریخ میں بارہ اشعار ہیں۔ مادہ تاریخ حسب ذیل ہے۔ ؎

گفت عزیزؔ ایں سالِ رحلت | زیر زمیں شد مہرِ ملت

عزیزؔ کی تاریخیں کسی مجموعہ میں طبع نہیں ہوئیں۔ اس لئے ذیل میں کچھ تاریخیں درج کی جاتی ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ عزیزؔ کو تاریخ گوئی پر کس قدر عبور تھا۔

۱۔ قطعۂ تاریخ وفات مرزا محمد عباس علی خانصاحب رئیس اعظم لکھنؤ

سیدی نادرۃ الدہر محمد عباس | دُرۃ التاج سر مجد و عُلا مرجع ناس

نصف شب منزل خود کرد بفردوس بریں | منتشر شد ہمہ شیرازۂ اجزائے حواس

ذکر او نشترِ رگہائے دلِ تنگِ عزیزؔ | طاقتے کو کہ دہد شرحِ غمش بر قرطاس

گفتم این مصرعِ تاریخ باندازِ سجع

رفتہ در بزمِ جناں سنہ محمد عباس

۲۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۳۴۶ھ میں کھولا گیا۔ عزیزؔ نے تاریخ کہی:-

[1] زبانی حافظ افتخار علی معلم جامعہ فرقانیہ فرنگی محل لکھنؤ۔

مایۂ فہم و خرد ارکانِ بزم سرفراز | جن کی قومی خدمتیں ہیں قابلِ تحسین داد
رات دن سرگرمِ خدمت ہے ترقی خواہِ قوم | بے ریا مخلص محمد قاسم والا نژاد
دل پہ نقشِ کالحجر ہے کوششِ خواجہ اسد | کارِ او پاینده باد و بختِ او تابنده باد
ہو گیا شکرِ خدا آج اس پریس کا افتتاح | آرزو رکھتے تھے جس کی قوم کے روشن نہاد

مصرعِ تاریخ برجستہ کہا میں نے عزیز
کھل گیا قومی پریس تو مل گیا نقشِ مراد

۱۳۴۶ھ

۳۔ تاریخ ولادت پسر مولوی اشفاق احمد صاحب کہ صبح نوروز پیدا شد

ز برجِ حمل شد برون آفتاب | رخِ صبحِ نوروز تابنده شد
پئے سالِ تاریخ گفتم عزیز | کہ۔ مہرِ دل افروز تابنده شد

۱۳۳۹ھ

۴۔ تاریخِ کتابِ مفتوں جلالپوری

اے نہ ہے فکرِ حضرتِ مفتوں | طبع موزوں ہے کہ دریا ہے
ہے یہ تاریخِ سالِ طبعِ کتاب | فکرِ مفتوں نشاط افزا ہے

۱۳۴۰ھ

تاریخِ وفات سید بندہ کاظم صاحب جاوید لکھنوی:۔

خلفِ حضرتِ امید خلافِ امید | رفت ازیں عالم و پیوست بذاتِ جاوید
طائرِ روح پرید از قفسِ عنصریش | نقش بر صفحۂ دل ماند صفاتِ جاوید
دفترِ مدح و مراثی کہ ازو یاد بماند | آں سجل است سجل بہرِ نجاتِ جاوید
گنجِ اسرارِ معانی بہ زمیں شد پنہاں | خاکِ بے مایہ گراں شد ز وفاتِ جاوید
گفت رضوانِ جناں سالِ وفاتش ز عزیز | یافت آں بندۂ مرحوم حیاتِ جاوید

۱۳۴۰ھ

۶۔ قطعۂ تاریخِ ختنہ فرزندارجمند آغا علی خاں صاحب تعلقدار و آنریری مجسٹریٹ الہ آباد

شدند از فضلِ حق مختوں جگر بندانِ محمودم
کہ در دیباچۂ اجلال ایں نام است زیب افزا
عزیز مخلص آور دراز مغاں مصراعِ تاریخی
ز شمعِ گل گر ختنہ بزم اسلام است زیب افزا

۱۹۲۲ء

۷۔ تاریخ عقد بارک اللہ صاحب پسر مولوی سبحان اللہ خاں صاحب رئیسِ گورکھپور

بارک اللہ جگر گوشۂ سبحان اللہ — کہ بر دو دۂ او پاک نفوسی نازد
آں جہاں محفل رنگیں ز مسرت آراست — کہ ز آہنگ طرب بلبلِ طوسی نازد
سینہ آراست بایں درجہ سرور باطن — کہ با قلیدس دل شکل عروسی نازد
سہر البتہ بدیں گونہ بروئے دافتش — لبِ گل از طرب آئینہ بوسی نازد
خامہ گل ریخت بایں مصرعِ تاریخ عزیز
بارک اللہ چہ عقد است عروسی نازد

۱۳۴۰ھ

۸۔ عزیز لکھتے ہیں :۔

۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو رفاہِ عام کے ایک عظیم الشان جلسہ میں جو مسٹر ممتاز حسین بیرسٹر ایٹ لا کی تعزیت میں منعقد ہوا تھا۔ مصنف نے یہ نظم پڑھی تھی[۱]

---

[۱] نسخۂ غیر مطبوعہ سے ماخوذ

سنِ ہجری:۔ مست ایں نوحہ ایستام براد رفت ممتاز حسین دلجو

۱۳۳۹ھ

سنِ عیسوی:۔ وردِ زبانِ شمعِ لحد ہے یہ سالِ غم تھا نامدار ہستی ممتاز قوم میں

۱۹۲۰ء

۹۔ تاریخِ وفات مولوی سید محمد تقی صاحب خلف سید ابراہیم صاحب حسبِ فرمائش مولوی ننّن صاحب:۔

مادۂ تاریخ سنہ ہجری میں:۔

رقم زد عزیز حزیں سالِ فوت جناں خوابگاہ محمد تقی

۱۳۴۱ھ

مادۂ تاریخ عیسوی میں:۔

نہاں بہ خاک شد و گفت سالِ فوت عزیز نہفتہ یک گل پاکے ز باغ ابراہیم

۱۹۲۲ء

سہرا نگاری

اردو میں سہرا نگاری کا رواج بہت قدیم ہے ذوق اور غالب کے سہرے بہت مشہور ہیں۔ دولھا کے ساتھ جن حضرات کو بارات میں چلنے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے اُن میں کچھ شعراء بھی ہوتے ہیں جن سے بالعموم یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اِس موقع کے لیے سہرا ضرور کہیں گے۔ ایسے شعراء بہت کم ہوں گے جو کسی بارات میں شریک نہ ہوئے ہوں یا انھوں نے سہرے نہ کہے ہوں۔ اگر سہروں کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا ایک ذخیرہ ہو جائے گا۔ لیکن ابھی تک صاحبانِ قلم نے اِسے اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا ہے اور نہ اِسے ابھی اصنافِ سخن میں شامل کیا گیا ہے۔

دیگر شعراء کی طرح عزیز نے بھی سہرا نگاری کی ہے ان سہروں میں تخئیل کی بلندی اور علم کی شان نمایاں ہے۔ اس میں عام طور سے

مبالغہ آرائی بہت کم ملتی ہے اگرچہ سہروں میں شعراء نے دل کھول کر مبالغہ فرمایا ہے۔ عزیز کے سہروں میں قصیدے کا انداز ملتا ہے۔ دولھا کی مدح میں وہی طرزِ ادا ہے اور وہی شوکتِ الفاظ۔

عزیز کے دو سہرے بطورِ نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ایک باقر العلوم مجتہد العصر جناب سید باقر صاحب کے پسر سید محمد صاحب مجتہد کی شادی کے موقع پر کہا گیا ہے اور دوسرا مولانا عبدالماجد دریابادی کے عقد سے متعلق ہے۔ یہ سہرے عزیز کے کسی مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہیں۔ مولانا دریابادی موصوف نے راقم سے اپنے سہرے کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہا کہ یہ سہرا میرے پاس تو محفوظ نہیں ہے مگر الناظر کے کسی رسالے میں شائع ہو چکا ہے۔ راقم کو یہ سہرا رضا لائبریری رام پور کی الناظر، کی فائل میں ملا۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کو یہ سہرا اس قدر پسند تھا کہ مجھ سے بار بار اس کو تلاش کرنے کے لئے کہا۔ انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ یہ سہرا جون ۱۹۱۶ء کے "الناظر" میں شائع ہوا تھا۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ مکمل سہرا مجھے حفظ تھا۔ مگر اب حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور بہت سے شعر بھول گیا ہوں۔ دو تین شعر جو انھیں یاد رہ گئے تھے بہت لطف لے لے کر سنائے۔

یہ سہرا جیسا کہ مولانا دریابادی نے بتایا تھا کہ جون کے "الناظر" میں شائع ہوا ہے۔ جون میں طبع نہیں ہوا تھا۔ مجھے ستمبر ۱۹۱۶ء کے الناظر میں ملا۔ اب ناظرین مولانا سید باقر صاحب مجتہد اور مولانا عبدالماجد صاحب کے سہروں سے لطف اٹھائیں۔

سہرا

بہ تہنیت عروسی فرزند جناب مولانا سید باقر صاحب قبلہ مجتہد العصر

۱۵ فروری ۱۹۲۲ءؔ[1]

نشاطِ طبع کیا ظاہر کرے معذور ہے سہرا
ولائے حیدری کے نشہ میں مخمور ہے سہرا

سوادِ خط میں ہے تفسیرِ واللیلِ اذا یغشیٰ
رُخِ تابندہ ہے مصحف و علےٰ نور ہے سہرا

محمد کی عروسی ہے خدا کا دین شاداں ہے
ہنسی پھولوں کی رک سکتی نہیں مسرور ہے سہرا

بندھا ہے کس کے سر پر یہ رسائی بخت کی اس کے
غرور و ناز بجا ہے اگر مغرور ہے سہرا

یہ زہدِ نوجوانی رائگاں کب ہونے والا تھا
نویدِ اے دل ثبوت سعیکم مشکور ہے سہرا

شہنشاہِ خراساں کے چمن کی اس میں نکہت ہے
شمیمِ گلشنِ دنیا سے کوسوں دور ہے سہرا

---

[1] سبدِ گل (غیر مطبوعہ)

رُخِ خورشید سے جیسے شعاعیں جگمگاتی ہیں
یونہی اک پرتوِ نورِ چراغِ طور ہے سہرا

ترا قرآں ہے جس کو دعوئ فاتوا بمثلہ تھا
خدا شاہد جوابِ سورۂ والنور ہے سہرا

یہ کس نے جعفری پھولوں سے لڑیاں اس کی گوندھی ہیں
کہ تبلیغِ شمیمِ شرع پر مامور ہے سہرا

عزیزؔ اس میکدے سے ہوش والے کم نکلتے ہیں
خبر رکھنا فریبِ نرگسِ مخمور ہے سہرا

یہ سہرا ایک مجتہد کے فرزند اور ایک عالمِ دین کے لئے کہا گیا تھا۔ پورے سہرے پر دین و مذہب کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ قریب قریب ہر شعر میں ایسے لفظ یا ایسی بندش کا استعمال ہوا ہے، جس کو مذہب سے کوئی نہ کوئی قربت ضرور حاصل ہے۔ مثلاً ولائے حیدری، تفسیرِ واللیل اذا یغشیٰ، مصحف، دعائے نور، خدا کا دین، زہد، حکیمِ مشکور، شہنشاہِ خراساں، پرتوِ نورِ چراغِ طور، قرآن، دعوئ فاتوا بمثلہ، خدا شاہد، سورۂ والنور، جعفری پھول، تبلیغ شمیمِ شرع؛ ان بندشوں سے عزیزؔ کے کلام میں بلاغت بڑھ گئی ہے۔

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ اس سہرے کو نظر میں رکھیں۔ اور اس کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے سہرے کو بھی پڑھیں۔ تو دونوں سہروں کا فرق خود ہی محسوس فرمائیں گے۔ ایک میں مجتہد کے شایانِ شان انداز اپنایا گیا ہے اور دوسرے میں ایک فلسفی کے مرتبہ کو دیکھتے ہوئے، فکر کی جولانیاں دکھائی گئی ہیں۔

سہرا بہ تہنیتِ شادی عبدالماجد دریابادی

"الناظر" کے مدیر لکھتے ہیں :-

نویدِ مسرت

"گذشتہ جون میں جب ہمارے لائق دوست مسٹر عبدالماجد بی، اے کی شادی ہوئی ہے تو مندرجہ ذیل نظم حضرتِ عزیز نے لکھی تھی، افسوس ہے کہ نظم کی تکمیل نہ ہو سکی جو کسی جلسہ میں پڑھنے کی نوبت آتی اب بھی مکمل نہیں ہے، بہر صورت جس حال میں ہے شائع کی جاتی ہے" [له]

ساقیا مجلس فروزِ نے ہو خاص انداز سے — چھیڑ نغمے قلقلِ مینائے مے کے ساز سے

طرح اندازِ سرِ ہنگامہ آرائی ہے تو — چشمِ مستِ ساغر و مینا کی بینائی ہے تو

ہے سہارا میکشوں کو صرف تیری ذات کا — کر دے حسنِ رخ سے زندہ فلسفہ جذبات کا

مے پلا کر حسنِ رخ کی گلفشانی دیکھنا — بادۂ گلرنگ میں رنگِ جوانی دیکھنا

ہے مرا پیرِ مغاں ساقی وہ اُمّی فلسفی — میکدے سے جس کے دورِ فانکھو مجھ کو ملی

ہو کسی پیرِ مغاں کے بادۂ صافی کا دور — تا کہ موجوداتِ عالم پر کروں کافی میں غور

دے کے ساغر پھر طبیعت کی روانی دیکھنا — منہ میں کوثر کے بھی بھر آئیگا پانی دیکھنا

آج تو فرقت نہ وہ بھی نشہ میں یوں چور ہوں — دل کے چھالے نے فروشِ بادۂ انگور ہوں

جلوۂ بنت العنب پردے ہی میں دکھلائے آج — ہوگی جاری میکدے میں راہ و رسمِ ازدواج

له "الناظر" لکھنؤ ماہ ستمبر ۱۹۱۶ء

دیر سے بیٹھا ہوں قسمت آزمائی کے لئے — دل جگر لایا ہوں ساقی رونمائی کے لئے
گردشِ ایام کا ساقی نہ مجھے کچھ غم نہیں — حلقۂ رندانِ میکش دورِ جم سے کم نہیں
دیکھ کر جس کو تصدق شانِ محبوبی ہوئی — سادگی محفل کی رنگِ شوخ میں ڈوبی ہوئی
صدر میں ہے رونق افزا ماجدِ والا گہر — جس کی دستارِ فضیلت پہ ہے سہرا جلوہ گر
علم پرور آج اِس محفل میں خوش ہو گئے فرد فرد — رونقِ بزمِ ادب ہے زینتِ بزمِ سرور
گلفشانی کا عزیز اب دل میں کب تک ولولہ — لڑ نہ جائے اُس کے سہرے سے سخن کا سلسلہ

اس سہرے کا رنگ بالکل جداگانہ ہے۔ یہ فلسفہ اور ادب کے ذکر سے مزین ہے۔ یہ بات روشن ہے کہ مولانا عبد الماجد ایک فلسفی اور ادیب و ناقد تھے۔ عزیز موقع و محل کا بہت خیال رکھتے تھے جس سے ان کا کلام زیادہ دلکش ہو جاتا تھا۔

عزیز کی شاعرانہ صلاحیت کے سلسلہ میں تضمین کا ذکر بھی ضروری ہے کسی دوسرے کے کلام کو اپنے کلام میں اس طرح شامل کرنا کہ وہ بے جوڑ نہ معلوم ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شعراء نے اس صنعت میں بھی خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ عزیز نے بھی مفتی میر عباس صاحب کی غزل پر تضمین کی ہے جو ایک مخمس کی شکل میں ہے۔ یہ تضمین عزیز کے کسی مجموعہ نظم میں شامل نہیں ہے لہذا ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ مفتی صاحب کی غزل۔ تجلیات کے صفحہ ۳۵۸ پر درج ہے۔ یہ ایک اخلاقی غزل ہے۔ اب تضمین ملاحظہ فرمائیے ؎

---

[۱] تجلیات (مفتی میر عباس کی سوانح حیات) ص ۳۶۱

یہ جھریاں ہیں یا ہے اثر پیچ و تاب کا
شیرازہ کھل چلا ہے بقا کی کتاب کا
نقشہ ہے حسرتِ دلِ خانہ خراب کا
زینت نہیں ہے رنگ نہ پوچھو خضاب کا
یہ ماتمی لباس ہے فوتِ شباب کا

ہر وقت چاہیئے کہ ہو آمادۂ ممات
ہوشیار اس سرا میں رہے دن ہو یا کہ رات
سن گوشِ ہوش سے اسے سننے کی ہے یہ بات
مٹتی ہے ایک دم میں یہاں صورتِ حیات
دیکھا ہے جیسے آپ یہ نقشہ حباب کا

کیوں رو رہا ہے حسرتِ عہدِ شباب میں
بتلا تو دیکھتا ہے سماں کیا یہ خواب میں
حدت بڑھی ہوئی ہے بہت آفتاب میں
کیا عیش ہم کو ملتا ہے دورِ شراب میں
مت کر خیال عشرتِ یادر رکاب کا

جب تم نہیں ہو پاس تو پھر عید کچھ نہیں
سبزہ ہو یا کہ گل ہوسِ دید کچھ نہیں
ثابت ہوا کہ حسن کی تقلید کچھ نہیں
ہم کو تمھارے لطف کی امید کچھ نہیں
پر خط لکھو اگرچہ ہو مضموں عتاب کا

کیا جانیں وہ ثواب ہے کیا کیا عذاب ہے
سمجھا ہے کوئی آکے تو اُس پر عتاب ہے
بس جمع خرچ آپ کا امّ الکتاب ہے
کھاتے ہیں سود روز شب اُس کا حساب ہے
آتا نہیں خیال بھی روزِ حساب کا

کھانے کو مال غیر کا حاتم ہیں یہ امیر
دینے کا وقت آئے تو بن جاتے ہیں فقیر
سائل کا ذکر کیا ہے کہ ہے وہ تو اک حقیر
ہے اس قدر زکواۃ سے نفرت کہ طفل و پیر
مکتب میں نام تک نہیں لیتے نصاب کا

ساری جو یادِ دوست مرے تن بدن میں ہے
یوسف کی بُو بسی ہوئی سب پیرہن میں ہے
حسنِ ملیح یار کا ذکر انجمن میں ہے
دل گرچہ ہے برشتہ ملاحت سخن میں ہے
جب تک نہ ہو نمک تو مزہ کیا کباب کا

کشتیٔ عمر کو مری آخر ڈبو دیا
ناسور بن گیا وہ مجھے داغ جو دیا
میں اپنے حالِ زار پہ خود آپ رو دیا
آنکھوں کا نور عالمِ پیری نے کھو دیا
گُل کر دیے چراغ کہ تھا وقت خواب کا

کل ہمنشیں جو تھے وہ لحد میں مکیں ہیں آج
ہے دور دورِ چرخ میں یہ کچھ عجب رواج
اکلمیل ہو کہ تخت ہو دولت ہو یا کہ راج

سیّد ہے خاک میری نظر میں سریر و تاج
ہے عشق آب و گِل میں مری بو تراب کا

عزیز لکھنوی اکبر الہ آبادی کی نظر میں

اکبر الہ آبادی نے اپنے خطوط میں کلامِ عزیز پر جو شعاعیں ڈالی ہیں ان میں بے تکلفی اور سچائی ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جھلکیاں ذیل میں پیش کر دی جائیں[1]

"آپ کی غزل میں یہ شعر

جس طرح چاہیں در سے اٹھوا دیں
ایک بیکس کی کیا حقیقت ہے

ایسے ہی شعر کہنا مشکل ہیں۔ اس غزل میں اکثر شعر لاجواب ہیں"

خط نمبر ۹۔ "آپ کا مطلع بہت یاد آیا کرتا ہے ؎

کیوں ہوس آپ سے ملنے کی ہے دن رات مجھے
جب میسر نہیں خود اپنی ملاقات مجھے

---

[1] یہ ریزہ چینیاں مکاتیب اکبر (بنام عزیز لکھنوی) سے کی گئی ہیں

"کبھی کبھی مجھ کو یہ خیال آتا تھا آپ نے موزوں کر دیا" خط نمبر ۴۲
"خوشی کی بات ہے کہ گلکدہ یونیورسٹی میں مقبول ہوا" خط نمبر ۱۹۳
"آپ کی ایک نظم نہایت پسند آئی اس وقت یاد نہ رہا کہ کہاں دیکھی تھی ... سندیلے آپ ہو آئے۔ غزل سننے کا مشتاق ہوں خط نمبر ۴۴
"اس وقت آپ کا یہ مقطع دیکھ کر ؎

یاد پھر آئی کوئی صحبت دیرینہ عزیزؔ
مجلس وعظ میں اب آپ کو کم دیکھتے ہیں

آپ کی یاد آگئی" خط نمبر ۵۳
"آپ کے شعر پر شاعرانہ وجد آیا۔ کیا بات پیدا کی ؎

دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ ہوں گے تنہا
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

واہ۔ معترض صاحب کا اعتراض اگر میں نہ سنتا تو کبھی یہ وہم بھی نہ آتا۔ اول مصرع میں جو ضمیر غائب ہے سارا مدارِ معنی اور انحصارِ رجوعِ خیالِ سامع اس پر ہے ؎

ہر کسے را بقدر ہمت اوست

"وہ ہوں گے تنہا"، وہ کے لفظ سے اگر خواہ مخواہ اور ضرورتاً اور بلا ارادہ اور فطرتِ سامع کی زبردستی سے خیال فی گوہر جان کی طرف رجوع ہو گیا تو دوسرا مصرع نہ معلوم کیا۔ مگر وہ منظر اسکے سامنے پیش کرے مگر عارفانہ مذاق اور بلند خیال اس ضمیر کو "شاہد تنہا نشینِ مسندِ حسن" (عرفی) کی طرف رجوع کریگا۔ ... خط نمبر ۷۰
"اپنے کچھ تازہ اشعار بھیج دیجئے" خط نمبر ۶۰

شیشۂ دل کو یوں نہ اٹھاؤ
دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

کیا غزل آپ نے کہی ہے اس غزل سے لکھنؤ کی عزت ہے۔ لکھنؤ کا نشان ملتا ہے، سب شعر اچھے ہیں۔ میں اپنے کرم فرما محمد نوح صاحب کی اگر کوئی بات پسند کرتا ہوں تو وہ یہ کہ وہ آپ کو لکھنؤ میں سب پر ترجیح دیتے ہیں"، خط ۹۴

"مساوات میں آپ کی غزل میں چند شعر صوفیانہ عارفانہ لاجواب ہیں۔ میں نے الگ لکھ لیے ہیں۔ آپ سوشل سطح سے بہت بلند ہیں۔ یہ راز فطرت ہے"، خط ۱۲۵

"آپ کا یہ شعر ؎

اہل دل سمجھے ہوئے تھے اپنا اپنا دل جسے | حشر میں دیکھا تو پیکاں تھا تمہارے تیر کا

اہل نظر کا ایمان ہے"، خط ۱۲۶

نہ میرے لیے ہیں نہ تیرے لیے | نہ اشعار یہ ہیں صلے کے لئے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز | کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

آپ کا قول نہایت بامعنی اور اخلاقی و روحانی ترقی کی راہ دکھانے والا ہے میں نے بہت پسند کیا اور موزوں کر دیا"، خط نمبر ۱۲

اسی خطوط کے مجموعہ مکاتیب اکبر کے ایک خط میں عزیز کے اسی قول کی اکبر نے مزید وضاحت فرمائی ہے، اکبر لکھتے ہیں:۔

"آپ کا یہ فرمانا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں مجھ کو جس سبب سے پسند آیا اس کی تفصیل ذرا مشکل ہے۔

۱۔ میرا مصرع شاید آپ کو یاد ہو "سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

۲۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ بلبل اگر کہے کہ میں اپنے لئے گاتا ہوں گرا مونون دوسروں کے لئے گاتا ہے تو اس کا کہنا بے جا نہ ہوگا۔

۳۔ تیسرا پہلو ایک شخص گنگنا رہا ہے۔ وہ اپنے لئے گاتا ہے۔ تانسین اکبر کے حضور میں گا رہے ہیں یہ اور کے لئے گا رہے ہیں۔

۴۔ چوتھا پہلو خاکسار ہوں۔ مُبتدی ہوں، اپنے لئے کہتا ہوں خود ہی کامل نہیں ہوں جب آپ کی طرح کامل ہو جاؤں گا اس وقت کہہ دوں گا کہ پبلک کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اگر در خانہ کس است یک حرف بس است۔"

"آپ کی غزل "بات پہ بات یاد آتی ہے" ایک دل افسردہ بلکہ مردہ کو ساعتِ چند کے لئے زندہ کر دیا۔ کیا غزل کہی ہے ؎

ہائے وہ رات یاد آتی ہے ہم تھے اور تم تھے چاند نکلا تھا
اکثر اوقات یاد آتی ہے ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
بات پہ بات یاد آتی ہے تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی

سبحان اللہ۔ وہ پھول ایسے ایک طرف سارا گلستاں ایک طرف"
خط ۱۷۹

"کل آپ کے تصور میں ایک شعر ذہن میں آیا تھا۔

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط
شہیدِ جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط

اس وقت اتفاقاً اور بے اختیار آپ کی ایک غزل پر نظر پڑی ؎

ہنگامِ نزع وصل کی حسرت ہی کیوں نہ ہو
وقتِ اخیر حسرتِ محبت ہی کیوں نہ ہو

پھر اہلِ دل میں قابلِ عزت ہی کیوں نہ ہو
مرنا ہے ایک دن تو محبت ہی کیوں نہ ہو

اس فطری لطافت اور جوشِ امتیازی نے آپ کو عزیز بنایا ہے دنیا کیا داد دے گی، دل ہر ذرہ در جوشِ انا الشرق۔ جو مصرع ہے زیبِ عنوان ہے" خط ۱۸۲

" آپ کے خط کے محض فقرات اِس قدر مؤثر ہیں کہ اسوقت ان کی نسبت کچھ نہیں لکھ سکتا" خط ۱۸۶

واہ رے پر آپ کے اکثر ایسے مصرعے ہیں کہ ایک مغربی شاعر اُن پر ناز کرے سبحان اللہ۔

رات دن سانچے میں وہ موتی یہ موتی ڈھالنا
ہو نشانِ باغِ رضواں پر وہ ڈورے ڈالنا خط ۳۱

کلام عزیز پر اِسی طرح کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ پور ایسی متعدد مقامات پر مختلف انداز میں قلمبند کی گئی ہیں۔

آخر میں عزیز کی ایک ایسی نظم کے چند شعر درج کئے جارہے ہیں جس کے لئے گمانِ غالب ہے کہ عزیز کی زندگی کی آخری نظم ہو کیوں کہ اسوقت وہ سخت بیمار تھے، ان کی بیماری "اڈیٹر سرفراز" اور خود عزیز کی مندرجہ ذیل تحریروں سے بھی ظاہر ہو رہی ہے، اڈیٹر سرفراز لکھتے ہیں:۔

" ذیل میں ہم اپنی قوم کے مایۂ ناز شاعر اور اخبار سرفراز کے قدیم سرپرست مولانا عزیز کی نظم مع ان کی تحریر کے شائع کرتے ہیں ناظرین سے استدعا ہے کہ آپ کی صحت کے لئے دعا فرمائیں" اڈیٹر[۱]

---

[۱] سرفراز لکھنؤ محرم نمبر ۱۳۵۴ھ مطابق اپریل ۱۹۳۵ء۔

جناب والا تسلیم

خدا جانے کس عالم میں یہ نظم آپ کو بھیج رہا ہوں ایک سال سے متصل بیمار رہا ہوں، امیدوار دعا ہوں۔ اگر نقصان نہ ہو اخبار میں درج فرما دیجئے گا۔ عزیز

جادۂ وفا

ازل کی بارگاہ کو سجا جو اہتمام سے
گذر گیا تجلیوں نے جلوہ گاہ عام سے

دکھا کے جادۂ رضا وفا کا عہد لے لیا
شہید دشت کربلا علیہم السلام سے

یہ تیسری کے چاند میں کہاں کا آج نور ہے
ضیا میں افتخار ہے جسے مہ تمام سے

خدا حجاب اٹھائے تو وہ دن عزیز آئے تو
عطا ہو جام کوثری حسین تشنہ کام سے

عزیز کی شاعری پر مجموعی نظر ڈالنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ عزیز درحقیقت ایک فطری شاعر تھے۔ اُن کے یہاں وضعداری اور روایت پسندی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ شاعری میں جدیدیت کا انقلابی رنگ پیدا کرنا اُن کے خلاف مزاج تھا مگر فرسودہ اور پامال طرزِ اظہار کو بھی نہیں پسند کرتے تھے، اپنے اور اپنے ماحول کے پسندیدہ پیمانوں میں عام طور سے شراب کہنہ کو پیش کیا، انھوں نے اپنے علم و فضل سے اپنی شاعری میں روح پھونک دی اور یہی ان کی شاعری کا انفرادی رنگ بھی ٹھہرتا ہے۔

باب چہارم

عزیز بحیثیت نثر نگار

نظم کے علاوہ نثر میں عزیز ایک ہمہ گیر حیثیت کے مالک ہیں۔ آزاد اور شبلی کی طرح یہ بھی بہت تنوع پسند ہیں۔ تنوع پسندی کی وجہ شاید یہ ہو کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے نثر کی ترویج و ترقی کا رجحان بہت عام ہوا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کے احسانات سے اردو نثر کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ انھیں لوگوں کی سعیٔ بلیغ سے اردو میں متعدد اصنافِ نثر پر کتابیں لکھی گئیں۔ طلبہ کے لیے درسی کتابیں بھی مرتب کی گئیں۔ مختلف موضوعات پر مضامین بھی سپردِ قلم ہوئے اور اخبار و رسائل کی زینت بننے لگے۔ اردو نثر کو پھولتے پھلتے دیکھ کر عزیز فطرتاً

اُس کی طرف متوجہ ہوئے، انھوں نے متعدد اصناف نثر پر قلم اٹھایا۔ عزیز کے نثری ذخیرے میں سوانح عمریاں، قواعد صرف و نحو کی کتاب، اردو محاورات کی لغت، متروکات سخن پر ایک تالیف، شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقیدیں، طلبہ کے لئے درسی کتابیں، تمثیل نگاری کی مثالیں، صحافتی مضامین اور مختلف موضوعات پر تحریریں موجود ہیں۔ ان ادبی خدمات سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کو بھی سر سید، نذیر احمد، آزاد، حالی اور شبلی کی طرح اردو کی ترویج و ترقی کی نہ صرف فکر تھی بلکہ نثر میں ایک بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے کی طرف خصوصی توجہ بھی۔

عہدِ عزیز میں اردو نثر اپنا مقفیٰ اور مسجع لباس اتار چکی تھی، مزاج میں پرانے زمانہ کا تصنع اور تکلف باقی نہیں رہ گیا تھا۔ زبان صاف، شستہ اور سلیس ہو چکی تھی اسلوب میں روانی اور اصلیت آگئی تھی۔ اس روانی اور بے تکلفی کا سنگِ بنیاد مرزا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ رکھا اور اس عمارت کی تعمیر سر سید اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے مکمل ہوئی۔ عزیز کے سامنے فسانۂ عجائب کی عبارت کا نمونہ بھی تھا اور اردو نثر کے عناصرِ خمسہ (سر سید، نذیر، آزاد، حالی، شبلی) کا اندازِ تحریر بھی۔ عزیز اگرچہ فطرتاً قدامت پسند تھے مگر انھوں نے قدیم اندازِ نگارش کو پسند نہیں کیا اور اپنے عہد کے رائج طرز کی تقلید شروع کی۔ مروج طرز میں عزیز کو غالب نذیر، آزاد، شبلی، رتن ناتھ سرشار اور سجاد حسین (اڈیٹر اودھ پنچ) کا اندازِ تحریر بہت پسند تھا۔ عزیز لکھتے ہیں:۔

"مرزا غالب کو اپنے مکاتیب پر ناز تھا کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔۔۔ آزاد کے یہاں زبان کی شستگی، روانی، برجستگی اس پر

ظرافت کی چاشنی سونے میں سہاگہ تھی۔ آزاد کا خط و خال ایک معمولی اردو داں بھی پہچان سکتا ہے۔ شبلی نے اپنی عبارت میں زور ادبیت دکھایا، نذیر کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان مانی گئی۔ رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین (اڈیٹر اودھ پنچ) کی نثروں نے لطافت زبان کے دریا بہادیئے... اُدبائے مذکورہ نے جو صاف ستھرے راستے نثر کے ایجاد کئے تھے اُس پر استعاراتِ بعیدہ اور تشبیہاتِ غریبہ کا ایک طلسم تیار کیا جا رہا ہے، بجائے اس کے کہ آزاد اور شبلی کی تقلید کریں شیکسپیر (SHAKESPEARE) اور ٹیگور کی تقلید کرتے ہیں"۔[1]

اِن تمام لوگوں میں سرسید اور حالی کا ذکر نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عزیز سلاست پسند تھے مگر سادگی پسند نہ تھے عزیز کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ حضرات میں محمد حسین آزاد کے اسلوب سے زیادہ متاثر تھے اور اُن کا اسلوب سلاست اور جزالت کا مجموعہ تھا۔ عزیز نہ فقروں میں ایسا زور پسند کرتے تھے کہ معنی دب جائیں اور نہ جملوں میں اتنی گہرائی کہ ذہن کو مفہوم تک پہونچنے میں دیر تک کاوش کرنا پڑے وہ صرف سلاست اور روانی کو فقرات کا زیور سمجھتے تھے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:۔

"نثر مقفیٰ اور مسجع کا رواج تو اب رہا نہیں نثر عاری کا دور ہے۔ اس کی خوبی سلاست و روانی ہے"[2]

---

[1] اشرستان ص۱۴۲ اور ص۱۴۵

[2] ایضاً ص۱۴۱

عزیز کی نثر میں بالعموم سلاست و روانی ہے اگرچہ کہیں کہیں ادبی زور بھی دکھلایا ہے۔ عزیز نثر میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان استعمال کرتے تھے۔ اہلِ علم (لکھنؤ کے) جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں وہی زبانِ عزیز کی تحریر میں ملتی ہے۔ عزیز الفاظ و محاورات اور اضافات وغیرہ کے استعمال کی صحت پہ گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے معاصرین میں صحتِ زبان و بیان کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے، اس سے متعلق ایک واقعہ خود نقل کرتے ہیں:۔

"مرزا (محمد ہادی رسوا) زبان کی خرابیاں دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ ایک زمانہ میں الواعظ مدرسۃ الواعظین کا رسالہ میری ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کو برابر دیکھا کرتے تھے۔ کسی صاحب کے مضمون میں "لوٹ کر، بمعنی پلٹ کر، لکھا ہوا تھا۔ اُن کے دماغ میں محفوظ رہا۔ لکھنؤ آئے تو مجھ سے ملتے ہی شکایت کی، کیوں صاحب جو رسالہ آپ کی ادارت میں نکلتا ہے اس میں "لوٹ کر، لکھا جائے"[1]

اگرچہ یہ خود عزیز کی تحریر میں نہ تھا مگر محاسبہ ہوا۔

عزیز کا اسلوب نگارش بڑا ہی سنجیدہ، متین اور پُر وقار ہے عربی اور فارسی کے فقرے اور اقوال کا استعمال بہت ہی برمحل ہوتا ہے۔ تحریر اور تقریر میں ان کا استعمال طبقۂ علماء میں بہت مقبول ہے عزیز کی جس تصنیف سے زیادہ دلچسپی صرف علماء کی ذات کو ہو سکتی ہے اس میں عزیز فارسی اور

---

[1] تجلیات ص۔۔

عربی کے الفاظ استعمال کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے مثلاً عزیز لکھتے ہیں:۔

"قسامِ ازل کے دربارِ عالم میں روزِ ازل جب جواہرِ علوم کا خزانۂ عامرہ کھولا گیا اور قسمت کے لئے سربستہ کیسوں کی مہریں توڑی گئیں تو بقدرِ مشیت ہر مستحق بہرہ مند ہوا۔ مگر اس علامۂ روزگار کو سب سے زیادہ حصہ اسی موہبت عظمیٰ سے مرحمت ہوا۔ ادھر عطائے منعم اُدھر ذوقِ تحصیل، دستِ شوق نے اپنے جیب و دامن میں وہ انمول موتی اور بیش قیمت لعل و یاقوت بھر لئے جو دوسروں کو دقت سے دستیاب ہوئے۔ عالمِ اسباب کی نمائش گاہ میں ان نعمتوں کو بمصداق "اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" ظاہر و آشکار کیا"۔[1]

شہیدِ ثالث قاضی نور اللہ شوستری کی سوانح عمری لکھی ہے جس کے دیباچہ میں بھی فارسی اور عربی آمیز زبان اپنائی ہے مگر اندازِ تحریر پُر وقار ہے۔ مثلاً "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

دور نے جب صحیفۂ عالم کی ورق گردانی کی نوبت سے جوہرِ قابل فردِ کامل ایسے دیکھے جن کی اصلیت پر نظر کرنے سے بہشتِ عرفاں کے دروازے کھل گئے جن کے حالات کے مشاہدے سے علومِ انبیا اور اسرارِ الٰہی کی عظمت ثابت ہوئی۔ ان کا خامۂ عجیب نگار شہیدِ روح القدس سے بہتر پایا۔ سیاہی کے ہر قطرے کو خونِ شہیداں

---

[1] تجلیات صہ

سے مرکب دیکھا ہے۔

اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانے کے لئے عزیز یہ اسلوب اپناتے تھے عام طور سے عزیز مشکل اور غیر مانوس الفاظ اور فارسی اور عربی کی ترکیبیں بہت کم استعمال کرتے تھے کبھی کبھی تو پیراگراف کا پیراگراف لکھتے چلے گئے۔ اور ایک بھی اضافت استعمال نہیں کی۔ ان کے تصانیف دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیر قلم تصنیف کی طرف متوجہ ہونے والے ناظرین اور ان کے معیار علم کو بھی ذہن میں رکھتے تھے۔ مثلاً عزیز نے مرزا محمد ہادی رسوا کے حالات لکھے ہیں، وہ جانتے تھے کہ مرزا کی حیات ہر ادبی ذوق رکھنے والے کے لئے باعثِ توجہ ہوگی جس کو عوام بھی پڑھیں گے اور خواص بھی۔ لہٰذا اس بات کا خیال رکھا کہ تحریر نہ تو اتنی عامی ہو کہ خواص اُسے دیکھنا پسند نہ کریں اور نہ اتنی عالمانہ ہو کہ عوام کو کوئی لطف نہ آئے ''مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات ''سے عزیز کی تحریر کا ایک نمونہ نقل کیا جاتا ہے:۔

> ''مرزا صاحب کا کلام اگر جمع کیا جاتا تو ضخیم کلیات ہوتا۔ مگر اُن کی بے اعتنائی اور بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ غزل کہی اور پھینک دی یا کسی نے مانگی تو وہی مسودہ اُس کو دے دیا۔ کلام جو کسی نے لے کر چھاپ دیا تو چھپ گیا ورنہ خود انھوں نے نہ کبھی چھپوایا نہ جمع کیا۔ خدا بخشے حکیم علی محسن خاں ابر مرحوم جس زمانہ میں معیار کی ہر طرح میں اُن سے کسی نہ کسی طرح غزل کہلوانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ اس مضمون میں اکثر غزلیں معیار کے مختلف نمبروں سے

لہ دیباچہ بر ''شہید ثالث''، ص ا

لی گئی ہیں لہ،،

پورے اقتباس میں کہیں ایک بھی اضافت نہیں ہے۔ ہر لفظ عام فہم ہے عزیز کے اسی انداز تحریر کو اُن کا بنیادی اسلوب کہا جاسکتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ خارجی مصلحتوں کی بنا پر کہیں انھوں نے تبحر علمی کا مظاہرہ کر دیا ہو، کہیں انشائیہ نگاری اپنائی ہو اور کہیں تمثیلی انداز پیش کر دیا ہو۔ کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے طائرِ تخیل کے پر پروانہ کی طاقت بھی دکھائی ہے۔ ان کے مضامین، شاعری کا دربار، میکدۂ خیال اردو کی شبِ معراج، مشاعرۂ جدید اور، مشاعرۂ عالمِ ارواح (دورِ اول، دوم) کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کی قوتِ متخیلہ کا اندازہ ہو گا۔

سوانح نگاری :۔ عزیز کی نثر میں تخیلی پہلو کے ساتھ ساتھ افادی پہلو بھی ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ مغرب کے سیلاب سے اکبر الہ آبادی کی طرح وہ بھی بہت متفکر تھے۔ ان کے اندر بھی قومی اصلاح کا وہی جذبہ تھا۔ تقریباً ان کی سبھی تحریروں میں یہ جذبہ کہیں واضح طور پر کہیں اشاروں کنایوں میں موجود ہے۔ بالخصوص عزیز نے اپنے سوانحی کارناموں میں شاندار ماضی کے ذکر سے قوم کی افسردگی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے علماء کے حالات بھی شاید اسی خیال سے لکھے ہیں۔ علمائے صالحین کا مرتبۂ علم۔ بلندیِ کردار، زورِ عمل اور بادِ مخالف کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت کا تذکرہ کر کے افرادِ قوم میں بلند حوصلگی پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے ان کی طبیعت کا رجحان سوانح نگاری کی طرف

لہ مرزا ادہ سوا کے تنقیدی مراسلات ص۱۰۸

زیادہ تھا۔ تجلیات، کے علاوہ "شہید ثالث، نورِ ساطع در حالاتِ شہید رابع خانوادۂ محمد قلی خاں بھی ان کے سوانحی تصانیف ہیں۔

تجلیات:۔ تجلیات کو عزیزؔ کی نثر نگاری کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب سات سو ساٹھ (۷۶۰) صفحات پر مشتمل ہے اور منشی محمد جواد صاحب کے زیرِ اہتمام نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے 26×2/8 کی تقطیع پر ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کتاب میں مفتی محمد عباس صاحب کے حالاتِ زندگی بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس کا تاریخی نام "تاریخ عباس" ہے۔ جس سے ۱۳۴۴ کے عدد نکلتے ہیں۔ اس کتاب میں عزیزؔ نے مفتی صاحب کے ہر جزوِ حیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اِسی لئے متعدد ابواب قائم کیے گئے ہیں اور ہر باب کے تحت متعدد موضوعات ہیں تاکہ زندگی کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہ پائے۔

مفتی صاحب کے کمالاتِ علمیہ اور مذاق شاعرانہ سے متاثر ہو کر عزیزؔ نے تجلیات تصنیف کی ہے۔ تجلیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی صاحب[۱] معقولات، حساب، فلسفہ، ہیٔت، ہندسہ، طب، تجوید و قرأت، ادب، تفسیر، حدیث، علمِ کلام، فقہ، منطق، تاریخ اور شعریات وغیرہ پر پوری طرح حاوی تھے۔ صرف و نحو۔ معانی و بیان، لغت و عروض وغیرہ پر بھی داکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ عزیزؔ نے مفتی صاحب کے ایک سو باسٹھ (۱۶۲) تصانیف کی ایک مختصر فہرست بھی دی ہے۔ یہ کتابیں اتنی تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ آج تک علماء ان سے استفادہ کرتے

---

[۱] تجلیات: ص۱۱

ہیں۔ عزیزؔ نے اپنی کتاب کے ذریعہ یہ ثابت کردیا کہ مفتی صاحب نہ صرف ایک عالم متبحر تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے متعدد اصنافِ نظم کی مثالیں نقل کی ہیں جس میں اردو کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ میر انیس جیسا نباض اردو بھی مفتی صاحب سے مشورۂ سخن کرتا تھا۔ یہ بات ثبوت کے ساتھ لکھ کر عزیزؔ نے مفتی صاحب کے ملکۂ شعر گوئی کو مستند کیا ہے۔ عزیزؔ اس جامع شخصیت کی تصویر جن الفاظ میں کھینچتے ہیں وہ قابلِ دید ہیں :-

"اس کتاب میں جس بزرگ کا جلوہ پیش نظر ہے وہ محفلِ ادبا کا صدر نشین۔ مجلسِ شعراء میں ملک الشعراء بزمِ فقہا کا مجتہدِ جامع الشرائط، بذلہ سنجوں کی بزم طرب میں بلبلِ ہزار داستان — شبستانِ معرفت میں عابدِ شب زندہ دار جس کی ساری بے نیاز زندگی اِس شعر[1] کا ماحصل ہے[2]۔"

عزیزؔ نے مفتی صاحب کے حالات بڑی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ صاحبِ ترجمہ کی اولاد، تلامذہ اور بیاضوں، کشکولوں سے براہِ راست حاصل کئے ہیں۔ صفحات کشکول پر بعض خطوط بھی چسپاں تھے جن میں اکثر مرزا غالب کے مراسلات[3] بھی تھے۔

---

[1] لیس الجمال باثواب تزیننا ‍ ‍ ‍ ‍ ان الجمال جمال العلم والادب

(جمال ان کپڑوں میں نہیں ہے جن سے زینت حاصل کی جاتی ہے۔ اصل جمال تو علم و ادب میں ہے)

[2] تجلیات ص۳

[3] تجلیات ص۱۰

اِس کتاب کی تالیف میں عقیدت اور ذاتی تاثرات بھی شامل ہیں۔ یہ بات محلِ نظر ضرور ہے مگر عزیزؔ کی سوانح نگاری میں ان باتوں کا راہ پانا قابلِ اعتراض اس لئے نہیں ہے کہ عزیزؔ کے سامنے جو کارنامے اردو سوانح کی صورت میں موجود تھے وہ بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ جس کی تصدیق نقادوں کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: ڈاکٹر عبدالقیوم کہتے ہیں۔

"۔۔۔۔ اردو سوانح عمریوں میں عقیدت اور ذاتی تاثرات نے فنی خوبیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس خامی کا شکار مولانا حالی بھی ہیں اور مولانا شبلی بھی۔ سید سلیمان ندوی نے تو ذاتی خیالات کو حقائق پر ترجیح دی ہے"۔[1]

عزیزؔ نے عقیدت سے کام تو ضرور لیا مگر ذاتی خیالات کو حقائق پر ترجیح نہیں دی ہے۔ انھوں نے مفتی صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو پر سچائی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ محاسن کے ساتھ کمزوریوں کا ذکر بھی ملتا ہے مثلاً مفتی صاحب کا اپنے عربی اور فارسی کلام میں انگریزی حکام کی بے انتہا ثنا و صفت کرنا جو صریحی طور پر ایک عالمِ دین کی خودداری کے شایانِ شان نہ تھا یا امانت میں سے قرض دے دینا جو اصول امانت کے خلاف ہے۔ عزیزؔ نے ان باتوں کے قلمبند کرنے میں عقیدت اور مروت سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ وہ سوانح نگاری کے تازہ مطالبات سے بھی واقف تھے اور اس کو ایک مشکل فن مانتے تھے جس کے ثبوت میں خود انھیں کا بیان موجود ہے۔

"مفصل سوانح عمری جس کو یورپ نے آج ایک مستقل فن بیاگرافی قرار

---

[1] سالنامۂ نگار (پاکستان) سنہ ۱۹۶۶ء ص ۱۹۶ مضمون از ڈاکٹر عبدالقیوم۔

دیا ہے در حقیقت کوئی معمولی کام نہیں۔ کسی کی زندگی پر بالاستیعاب ایسی نظر کرنا کہ کوئی جز و ہستی نظر انداز نہ ہو تصنیف سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"[1]

عزیز کے سوانحی تصانیف میں کہیں طوالت اور کہیں موضوعات میں بے ترتیبی ہے۔ مگر ان خامیوں کی ذمہ داری عزیز سے زیادہ رائج الوقت طرزِ سوانح نگاری پر ہے۔ مثلاً "حیاتِ جاوید" پر ایک ناقد اس طرح اظہار رائے کرتا ہے:۔

"حیاتِ جاوید ضخامت کی وجہ سے بیسویں صدی کے بعض نقائص کو جھلکاتی ہے۔ مثلاً غیر ضروری تصریح و طوالت، تشنۂ ترتیب مواد، بندھے بندھائے عنوان وغیرہ۔"[2]

عزیز کی اس تصنیف میں کچھ مفید مطالب انکشافات بھی ملتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی ادبی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً مرزا غالب اور مفتی صاحب کے تعلقات اور دونوں میں ادبی اور علمی مراسلت، میر انیس اور مرزا دبیر سے گہرے مراسم۔ کسی نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ میر انیس اور مرزا دبیر میں اولیت کس کو حاصل ہے اس کا جواب مفتی صاحب نے بہت ہی تشفی بخش دیا۔ یہ جواب عربی زبان میں ہے جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"سید کا کلام شیریں اور فصیح میرزا کا کلام دقیق اور بلیغ ہے۔ اور بہ اختلافِ ذوق و لذت کوئی محلِ ترجیح نہیں۔ کوئی میٹھا پسند

---

[1] تجلیات ص ۹

[2] نگار (پاکستان) اصناف ادب نمبر ص ۲۰۷

کرتا ہے کوئی مکین۔ اچھے مواقع اور مصالح پر دونوں پسند کیے جاتے ہیں۔۔ بلے[1]

"اس کتاب میں کہیں کہیں دقیق اور غیر مانوس الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ جیسے مرتاض، ادقع، کظم غیظ، ضیق معاش وغیرہ، ہو سکتا ہے کہ طبقۂ علماء میں اپنے علمی معیار کو ظاہر کرنے کے لئے عزیز نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہوں، حلقۂ علماء میں یہ کتاب بہت مقبول ہے اس کتاب میں عزیز نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ اسے حقائق کی محض ایک خشک وادی نہ بنایا جائے۔ اسی لئے ڈاکٹر جانسن[2] نے سوانح کو اصناف ادب میں شامل کیا ہے۔ اس میں شعوری طور پر ایک فرد کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ لہذا تاریخ سے مدد لینا پڑتی ہے۔ اس کا ایک لازمی عنصر دلکشی اور تاثر بھی ہے جس کی بنا پر اس کا رشتہ ادب سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس طرح سوانح میں تاریخ، فردِ واحد اور ادبیت تینوں کے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ عزیز اس رمز سے واقف تھے اس لئے جگہ جگہ ادبی انداز اپنایا ہے۔ مفتی صاحب کی شخصیت پر قلم اٹھایا تو اس طرح پھول کھلائے۔

"اس شبستان میں خدا جانے کس کس کی شمع حیات خاموش ہوئی مگر محفل سے دھواں تک نہ اٹھا۔ مرنا انھیں کا ہے جن کے غم میں دنیا کے کلیجہ سے شعلے بھڑک اٹھیں اور قیامت تک تسلی کا پانی انھیں بجھا ہی نہ سکے۔

---

[1] تجلیات باب نہم ص ۱۹۱

[2] ڈاکٹر جانسن کو انگریزی ادب میں ایک اہم مرتبہ حاصل ہے۔ انھیں فن سوانح نگاری کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بے شک مرنے والے یا یوں کہوں حیات ابدی حاصل کرنے والے وہی ہیں جن کے نقش قدم ہمارے واسطے چراغ ہدایت بنے ہوئے ہیں، اور اس ظلمت کدہ میں ستاروں کی پریشاں انجمن کا سماں دکھلا رہے ہیں صدیوں کی ورق گردانی کے بعد بھی زمانہ کسی کو اُن کی جگہ نہیں بٹھا سکتا ایسے ہی لوگ مادر وطن کے مایۂ ناز فرزندوں میں ہیں انھیں افراد کا نہ میں ہمارے گروہ کا یہ نادرۃ العصر اور بارھویں صدی کا روح رواں تھا جس نے باوجود دنیاوی کش مکش کے زندگی کے فرائض کو اس طرح ادا کیا کہ اپنے آثار قدم کو دوسروں کے لئے آئینہ عبرت بنا دیا ہے[1]

مفتی صاحب کا مبلغ علم ظاہر کرنے کے لئے اس طرح گہر افشانی کرتے ہیں:۔

"رگوں میں خون کی جگہ علوم و فنون کی نہریں جاری ہیں۔ سینہ جواہر گوناگوں کا معدن، دماغ گنجینۂ اسرار، دل تجلی زار رحمت ہے[2]"

اس میں شک نہیں کہ تجلیات عزیز کا معرکتہ الآرا کارنامہ اور سوانح نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کے باوجود تجلیات نہ سوانح عمریوں میں مشہور ہوسکی اور نہ عزیز سوانح نگار کی حیثیت سے ہی یاد کئے گئے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ کتاب عربی اور فارسی کے اقتباسات سے بھری پڑی ہے۔ دوسرے یہ کہ مفتی صاحب کے علمی اور ادبی کارنامے صرف عربی اور فارسی ادب کی زینت ہیں۔ علاوہ ایک مثنوی کے اردو میں اپنی کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی اس کے علاوہ آپ کی زندگی بہت ہی متشرع اور محتاط رہی نہ کبھی رکن حکومت

---

[1] تجلیات، باب چہارم ص۱۰۰
[2] تجلیات باب پنجم ص۱۹۶

بنے اور نہ کبھی سیاسیات میں اپنے کو الجھایا، ایک پارسا، ایک واعظ، ایک عالم دین، ایک مجتہد کے صوم و صلوٰۃ رکوع و سجود، زہد و ورع علم و اتقا، خوش کرداری و صدق گفتاری سے عام لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اب اندازِ نظر بدل چکا ہے اور ذوقِ علم میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہو چکی ہیں انھیں وجوہ سے بے لاگ سوانح عمری کا ایک اچھا نمونہ ہوتے ہوئے بھی یہ کتاب مشہورِ عالم نہ ہو سکی۔

شہیدِ ثالث دوسری سوانحی تصنیف قاضی نور اللہ شوستری کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے جو نسخہ راقم کی نظر سے گذرا وہ ۲۲*۱۸ کی تقطیع پر ۱۹۲۵ء میں تیسری بار نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوا ہے۔ مولانا ناصر حسین صاحب کی تقریظ، قاضی صاحب کے مزار کا فوٹو اور عکسِ تحریر کے بعد عزیز کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے قاضی صاحب کے حالاتِ زندگی کے مستند ماخذ گنوائے ہیں۔ مفصل سوانح عمری نہ لکھ سکنے کی وجہ بھی لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ قاضی صاحب سے متعلق جو واقعات مشہور ہیں مگر کسی تاریخ یا بیانِ موثق سے اُن کی تصدیق نہیں ہو سکی انھیں احاطۂ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اس دیباچہ میں عزیز نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ بعض اہلِ قلم ان کے مضامین کا سرقہ بھی کرتے ہیں اور یہ کہ وہ قاضی صاحب کے حالات برابر حاصل کرتے رہے اسی لئے طبعِ اول و ثانی سے زیادہ حالات طبعِ سوم میں درج ہے۔

شہید ثالث کے حالات شروع کرنے سے پہلے شہید اول اور دوم پر بھی ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ شیخ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن مکی شہید اول کو ۹ جمادی الاول ۷۸۶ھ کو ایک سال تک شام میں قید رکھنے کے

بعد تلوار سے قتل کیا گیا اور پھر جلایا گیا۔ وجہ شہادت یہ تھی کہ ایک دشمن نے شیخ صاحب پر کوئی الزام لگایا جس کو قاضی وقت نے صحیح قرار دیا اور بادشاہ نے یقین کرتے ہوئے سزا سنا دی۔ شیخ صاحب کثیر التصانیف تھے۔ عزیز نے ان کی پندرہ اہم دینی کتابوں کی فہرست دی ہے۔ اسکے بعد شیخ اجل زین الدین بن علی محمد بن جمال بن تقی الدین صالح ملقب بہ شہید ثانی کے مختصر حالات درج کئے ہیں ان کی ۲۷ کتابوں کے نام لکھے ہیں ان کے متعلق مفصل حالات معلوم کرنے کے لئے کچھ کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں انھیں "۹۶۶ھ میں بمقام قسطنطنیہ شہید کیا گیا۔[1] ان دونوں شہیدوں کے ذکر کے بعد شہید ثالث کے حالات شروع ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب کے حالات بائیس صفحات پر مشتمل ہیں یہ حالات اٹھارہ کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جن کتابوں سے سوانح حاصل کیے گئے ہیں ان میں "دربار اکبری" کو چھوڑ کر سب عربی یا فارسی میں ہیں۔ جگہ جگہ عربی عبارت کا ترجمہ بھی عزیز نے کیا ہے۔ قاضی صاحب کا سال ولادت، سلسلۂ نسب، تحصیل علوم اور ہندوستان میں ورود وغیرہ پر روشنی ڈالنے کے بعد قاضی صاحب کے متعلق مورخین کی جو رائیں عزیز نے نقل کی ہیں ان سے قاضی صاحب کی شخصیت کے بہت سے اہم پہلو واضح ہوتے ہیں جس کے لئے عزیز کی تلاش و جستجو اور کد و کاوش قابل داد ہے۔ قاضی صاحب کو انواع علوم پر دستگاہ حاصل تھی۔ انھیں علوم پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد ایک سو نو[109]

---

[1] کتاب الرجال از سید مصطفیٰ بن حسین تفریشی بحوالہ شہید ثالث: ص ۹

تک پہونچتی ہے۔ اس کتاب کے آخری ورق پر مولانا نجم الحسن کی تقریظ ہے جس میں عزیز کی تحقیق و تجسس کی داد دی ہے۔

نور ساطع در حالات شہید رابع

عزیز کی تیسری تصنیف "نور ساطع در حالاتِ شہید رابع" ہے۔ یہ [illegible] صفحات پر مشتمل ہے۔ تجلی پریس دہلی میں ۸/۲۲+۱۸ کی تقطیع پر طبع ہوئی اور امیر بک۔ ایجنسی نے اسے شائع کیا۔ اس کتاب میں حکیم میرزا محمد صاحب متخلص بہ کامل کے تبحر علمی کو واضح کرنے پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہے۔ اسی کے ضمن میں کچھ مورخین اور معاصر علماء کی رائیں درج کی گئی ہیں۔ مرزا صاحب کی سولہ کتابوں کے نام بھی لکھے گئے ہیں۔ انھیں تصنیفات میں "نزہۃ اثنا عشریہ" بھی شامل ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" کا جواب ہے۔ اس کے متعلق عزیز نے اپنے تاثرات بھی ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ علامہ موصوف نے اس کتاب سے دینِ اسلام کی ایسی حمایت کی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ راہِ خدا میں ایسا جہادِ لسانی کیا جس کے سامنے جہادِ سیفی و سنانی کی کوئی حقیقت باقی نہ رہی۔ دین کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور قلعۂ اسلام مستحکم ۔۔۔۔ سب سے بڑا شرف اس گرانمایہ تصنیف کو یہ حاصل ہوا کہ اس کی وجہ سے علامہ ممدوح درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔"[1]

عزیز کی یہ تصنیف بھی طبقۂ علماء سے متعلق ہے اس میں بھی وہی

---

[1] نور ساطع در حالات شہید رابع ص۲۴ تا ۳۰

اندازِ تحریر اپنایا گیا ہے جو "تجلیات" یا "شہید ثالث" میں پایا جاتا ہے۔ اس میں سوانح عمری کے اہم عناصر مثلاً ولادت، خاندان اور اخلاق و عادات وغیرہ پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو سوانح عمری نہ کہکر صاحب ترجمہ کا بلیغ علم المعروف بہ تذکرہ "نزہۃ اثنا عشریہ" کہنا چاہیئے یہ کتاب مرزا صاحب کے حالات زندگی جاننے کے لیے کافی نہیں ہے مگر اردو میں مرزا صاحب کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا گیا تھا، لہٰذا عزیز نے دامنِ اردو کو اس ذکر سے خالی نہیں رہنے دیا۔

تذکرہ خانوادۂ علامہ محمد قلی: عزیز کی چوتھی سوانحی تصنیف "تذکرہ خانوادۂ علامہ محمد قلی" ہے۔ یہ ایک قلمی نسخہ ہے جو کتب خانہ ناصریہ شاستری نگر لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ آفس رجسٹر کا سائز ہے اور مجلد ہے یہ ایک سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف کا مقصدِ اصلی مولانا حامد حسین صاحب کے حالاتِ زندگی لکھنا تھا مگر ان کے علاوہ علامہ محمد قلی خاں صاحب، علامہ سید اعجاز حسین، علامہ سراج حسین، علامہ حبیب کنتوری اور مولانا ناصر حسین صاحب کے مختصر حالات زندگی بھی لکھے گئے ہیں۔ ان حضرات کی ولادت، تعلیم، شادی، ملازمت اخلاق، زہد، تبحرِ علمی اور تصنیفات کے ذکر سے شخصیت کی مصورانہ مختصر

ع ۱۔ "نزہۃ اثنا عشریہ" ایک شخص کو اتنی ناگوار ہوئی کہ اس نے اپنی بیماری کا ڈھونگ رچایا اور بادشاہِ وقت کی قرابت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بذریعہ علم شاہی اپنے علاج کے لئے مرزا صاحب کو زبردستی بلوایا اور زہر دلوا دیا۔

الفاظ میں کی گئی ہے۔ علامہ محمد قلی کا شجرہ بھی دیا گیا ہے جس کا سلسلہ امام موسیٰ کاظم پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ساتویں اور آخری فرد مولانا نجم الحسن[1] صاحب کی ذات ہے۔ ان کا تعلق خانوادۂ محمد قلی سے نہیں تھا۔ خدا جانے اس کتاب میں ان کا ذکر کس خیال سے کیا گیا۔ تصنیف کو پڑھ کر صاحبانِ ترجمہ کی ہلکی سی تصویریں پردۂ ذہن پر بن جاتی ہیں۔

تالیف کا ایک حسن موضوعات کی ترتیب و تنظیم بھی ہے جس کی مثال باسول (BOSWELL) نے جانسن (JOHNSON) کی سوانح عمری لکھ کر پیش کر دی۔ عزیز نے یہ انداز نہیں اپنایا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز موضوعات فراہم کر رہے تھے اور بعد میں ترتیب دینے کا خیال تھا مگر حالات نے اجازت نہیں دی اور سلسلۂ تصنیف منقطع کرنا پڑا۔ تجلیات میں ایک ایسا اشارہ بھی ملتا ہے جس سے میرے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ عزیز لکھتے ہیں:-

> میں نے رئیس المتکلمین مولانا سید حامد حسین صاحب طاب ثراہ مصنف عبقات الانوار کے حالات لکھنا شروع کئے لیکن حالات اور واقعات کی فراہمی میں دقتیں پیش آئیں۔ ادھر میں عدیم الفرصتی سے تحقیق کے ذرائع حاصل نہ کر سکا

---

[1] عزیز نے آپ کے بہت مختصر حالات لکھے ہیں جس میں یہ لکھا ہے کہ آپ کو مفتی میر عباس صاحب نے نجم العلماء کا خطاب عطا فرمایا تھا اور مدرسۃ الواعظین لکھنؤ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، واضح رہے کہ مولانا موصوف وہ نجم الحسن نہیں ہیں جو مولانا ناصر حسین کے خویش تھے۔

کتاب ناتمام رہ گئی۔"[1]

عزیز کے ان چاروں تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ سوانح عمری کی صحیح تصویر صرف تجلیات میں نظر آتی ہے۔ باقی کتابوں کو تذکرہ یا تعارف کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان میں حالات کا پھیلاؤ اور تجزیہ اتنا کم ہے کہ شخصیت زیادہ واضح اور نمایاں نہیں ہو پاتی۔ عزیز کو سوانح نگاری سے قومی اصلاح کا کام بھی لینا تھا۔ اسی لئے انھوں نے مثالی فردوں کو منتخب کیا۔ ماحول کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ حیات کے تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ اسی لئے عزیز کے زمانہ میں اردو کی دوسری سوانح عمریاں بھی اسی قسم کی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

سوانح نگاری میں شخصیت کا انتخاب بھی ایک مشکل عمل ہے۔ عزیز نے انھیں شخصیتوں کا انتخاب کیا جن کا تعلق طبقۂ علما سے تھا۔ انھیں افراد کے متعلق عزیز کے پاس براہ راست معلومات کا ذخیرہ تھا۔ عزیز زیادہ تر حلقۂ علما میں رہتے تھے۔ عزیز کے والد غلام اور جیرالاستعداد برادر علماء کے حالات پر کتابیں لکھ چکے تھے۔ انھیں جتنی معلومات علمائے کرام کی بابت فراہم ہوسکتی تھیں کسی دوسری فرد کے متعلق نہیں ممکن تھا۔ ایسے موقر اور قابلِ احترام شخصیتوں کی سوانح نگاری میں عقیدت کے عناصر فطرتاً غالب رہتے ہیں۔ یہی باتیں عزیز کی سوانح نگاری میں بالعموم موجود ہیں۔ ان پابندیوں کے باوجود انھوں نے حق گوئی میں مروت کو زیادہ دخیل نہیں ہونے دیا۔

لغت:- عزیز اللغات:- مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ عزیز نے اردو کا ایک

---

[1] تجلیات ص ۹

لغت بھی تالیف کیا ہے۔ یہ لغت "عزیز اللغات" کے نام سے سید عبدالواسع کے زیر اہتمام انوار احمدی پریس الہ آباد سے طبع ہوا۔ یہ تالیف سات سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تقطیع $\frac{30\times 20}{16}$ ہے۔ اس لغت میں خلاف معمول بات یہ ہے کہ اسے لفظ "اللہ" سے شروع کیا گیا ہے، یہ بات کسی اور لغت میں نہیں ملتی۔ "اللہ" اور اللہ سے بننے والے تمام محاورے لکھنے کے بعد حروف تہجی کے قاعدہ کے تحت لفظ "اب" سے لغت شروع ہوتا ہے۔ لغت کو چار سلسلوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اُن سلسلوں کے نمونے دے کر تالیف کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا سلسلہ انگریزی الفاظ کا ہے اور چار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سو تیس انگریزی الفاظ معہ معانی درج ہیں۔ یہ الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ عزیز اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جو الفاظ عام بول چال میں چل نکلے ہیں ان کے استعمال کو معیوب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

> "اس وقت اردو میں بے شمار الفاظ انگریزی کے داخل ہوتے جاتے ہیں۔۔۔ اردو میں جن انگریزی الفاظ کے مرادفات بآسانی مل سکتے ہیں ایسے مواقع پر خواہ مخواہ انگریزی الفاظ استعمال کرنا اردو پر صریحی ظلم کرنا ہے۔ مثلاً "وقت"، "سند"، "گودام"، "ریاست ہائے" کو چھوڑ کر "ٹائم"، "سرٹیفکٹ"، "اسٹور"، "اسٹیٹ"، "اسٹیم" بولنا سخت نادانی ہے، جو الفاظ اردو میں جذب ہو گئے ہیں ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔"[1]

---

[1] عزیز اللغات: سرخی "انگریزی الفاظ"، ص ۱

دوسرے سلسلہ میں متفرق محاورات اور ضرب الامثال جمع کیے گئے ہیں یہ سلسلہ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ کچھ نمونے پیشِ خدمت ہیں۔

"آدھی روٹی ڈیڑھ پاؤ شکر (احمقانہ اسراف) آدھی آنے آخر کھپا دودھ پیا ہے (خطا سرزد ہونا لازمی ہے) آدھی کے واسطے پیسہ کا تیل جلانا (انتہائی احتیاط سے مراد ہے یعنی حساب کی جانچ کے لیے وہ آدھی کی ہی غلطی کیوں نہ ہو پیسہ کا تیل جلا کر رات کو جانچ کرنا)[1]

تیسرا سلسلہ "اخباری اصطلاحات" کا ہے۔ یہ اصطلاحات ستائیس صفحات پر مشتمل ہیں اس سلسلہ کے تحت وہ انگریزی الفاظ جو عام طور پر اخباروں میں مستعمل ہو رہے تھے درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً اپوزیشن (OPPOSITION) وہ پارٹی جو دار العوام میں برسرِ اقتدار نہیں ہوتی۔ اس کو فریقِ مخالف بھی کہتے ہیں یہ پارٹی گورنمنٹ کے معاملات پر نکتہ چینی کرتی ہے اٹیچے (ATTACHE) نوجوان جو سفیر کے عملہ سے متعلق ہوتا ہے اس کا صحیح تلفظ اٹاشے ہے۔ ٹرپل الائنس (TRIPLE ALLIANCE) اتحادِ ثلاثہ سنہ ۱۸۸۲ء میں قائم ہوا۔ جرمنی

---

[1] اس محاورے میں آدھی کی جگہ اَدھی ہونا چاہیئے۔ نور اللغات ص ۲۶ پر یہ محاورہ اَدھی سے ہی لکھا گیا ہے۔ پیسہ کے آٹھویں حصہ کو اَدھی کہتے ہیں۔ یہی معنی عزیز اللغات ص ۲۱ پر بھی لکھے ہیں۔ اَدھی کی جگہ پر آدھی لکھ جانا طباعت کی غلطی بھی نہیں ہے کیوں کہ لفظ آدھی الف ممدودہ کے دوسرے لفظوں کے بیچ میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عزیز نے بطورِ خود آدھی اور اَدھی میں کوئی فرق نہ سمجھا ہو یا اَدھی کو ہی صحیح قرار دیا ہو۔

آسٹریہ اور اٹلی کا اتحاد باہمی (اپنے دشمن کا سب مل کر مقابلہ کریں) دی اسپکٹیٹر (THE SPECTATOR) ایڈیسن کا ایک مشہور اخبار جو ۱۷۱۱ء میں نکلا تھا۔ یہ چار اصطلاحیں مع تشریح بطور نمونہ نقل کی گئیں۔ اسی طرح بہت سی مفید مطلب اصطلاحیں لکھی گئی ہیں۔ لفظوں کو انگریزی رسم الخط میں بھی مابین قوسین درج کیا گیا ہے۔ انگریزی کے مخففات (ABBRIVIATION) بھی دیئے گئے ہیں۔ عزیزؔ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر اپنی حکمت عملی سے یہ کام بڑی صحت کے ساتھ انجام دیا۔

چوتھا سلسلہ الفاظ و محاورات اسے متعلق ہے۔ جناب عزیزؔ نے محاورات کو ذخیرہ کر دینے میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ مثلاً صرف دل سے بننے والے تقریباً ایک سو چون محاورات ہیں۔ نور اللغات میں بھی محاوروں کی کافی تعداد ہے۔ مگر طریقۂ تحریر کچھ ایسا ہے کہ کوئی مخصوص محاورہ آسانی سے نہیں ملتا۔ یہ زحمت عزیز اللغات میں نہیں ہے۔ فرہنگِ عامرہ میں اس لفظ سے بننے والے تقریباً پچپن محاورے ہیں۔ عزیزؔ کی توجہ محاورات پر زیادہ تھی۔ مفرد لفظوں کے معنی درج کرنے پر زیادہ مائل نہ تھے۔ یوں ہی جو سامنے آ گئے لکھ دیئے۔ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو عام استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے نئے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے "چار باغ"، (وہ شالی رومال جس کے چاروں کونوں پر گل بوٹے بنے ہوں۔ یہی نور اللغات نے بھی لکھا ہے۔ مگر فرہنگ عامرہ میں اس لفظ کا کوئی ذکر نہیں۔ محاورات کی تعداد بہت ہے۔ مثلاً 'دل' کے علاوہ 'سر' سے بننے والے محاورات کی تعداد بھی تقریباً ایک سو چون ہے۔

اس لغت کے متعلق عزیزؔ نے مقدمہ میں کچھ تفصیل لکھی ہے۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں جو اس تالیف کے متعلق بہت سے امور پر روشنی

ڈالتے ہیں:۔

"اردو زبان ہنوز روبہ ترقی ہے اور ایک علمی زبان کا انداز اختیار کرتی جاتی ہے۔ جب اس کے مختلف محاورات اور مصطلحات پر غور کیا جاتا ہے تو یہ ایک اہم بالشان زبان معلوم ہوتی ہے۔۔۔ راقم کو فطری ذوق اساتذہ اردو اور فارسی کے کلام کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کا ہے اور اسی شغل میں زیادہ وقت گذرتا ہے۔ میں نے اکثر لغاتِ اردو دیکھے ان میں بعض ایسے بھی پائے جن کی ٹکسالی زبان اور محاورات کی کمی محسوس کی۔ بعض اردو لغت طلبائے اسکول کے لئے تالیف ہوئے۔ نوعمر طلبہ تو لغت میں جو محاورات لکھے ہوں گے انھیں کو صحیح و مستند سمجھیں گے مگر جب لغات نگار خود ہی زبان و محاورات سے واقفیت نہ رکھتا ہو تو اس کی لکھی کتاب یقیناً ٹکسال باہر ہے۔

اس لغت کی ترتیب کے بعد میرا یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تمام لغات سے بہتر اور لائق ہے۔ مگر اس میں زیادہ تر مواد اردو زباندانی اور محاورات صحیحہ کا ہے۔ اس لغت کے لکھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ طلبائے مدارس صحیح اور مروجہ زبان اور محاورات سے واقف ہوں اور اردو لکھنے پڑھنے میں مستند محاورات کا استعمال کر سکیں۔

میں نے اس لغت میں عربی و فارسی لغات و محاورات کی بھرمار نہیں کی ہے۔ وہ نوعمر طالب علم جو اپنے مشاغلِ علمی کی وجہ سے اردو زبان کے محاورات کو تحقیق کرنے کا موقع نہیں پاتے وہ اس لغت سے بآسانی مستفید ہو سکیں گے۔

جب تک طلبہ اردو زبان کے الفاظ و محاورات سے واقف نہ ہوں گے اردو عبارت فصیح اور دلآویز نہ بول سکیں گے۔ ان ضروریات کا لحاظ کر کے یہ لغت لکھا گیا ہے ...

ہم نے یہ لغت اپنے مکرم دوست جناب مولوی حافظ سید جلال الدین احمد کی فرمائش پر لکھا۔ یہ مکمل نہیں۔ شواہد و امثال و طولِ عبارات مزید تحقیقات سے احتراز کیا گیا۔ شعراء اور اساتذۂ فن کے لیے یہ کتاب نہیں۔ اس لغت میں مصادر کے معنی وضاحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں مگر اکثر معنی محتاج امثلہ ہیں۔ بغیر مثالوں کے ذہن اُن معنوں کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا مگر چونکہ شواہد و امثلہ بالالتزام نہیں لکھے گئے ہیں اس لیے مجبوراً وہ مقامات چھوڑ دیے گئے ہیں ...

نکتہ چیں نگاہیں بہت سے مقامات پر لغزشیں ڈھونڈھ لیں گی مگر بجائے اس کے کہ وہ مولف کو موردِ طعن و ہدفِ ملامت بنائیں اگر اس کو آگاہ کریں تو مزید احسان ہوگا۔ تاکہ غور کے بعد شکرگزاری کے ساتھ دوسرے اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے۔"[1]

لغت کی خوبیاں اور خامیاں مؤلف کے قلم سے ظاہر ہو گئیں لہٰذا انھیں باتوں کا اعادہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

دیگر تصانیف

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ تصانیف کے علاوہ بھی نثر کی کچھ

---

[1] عزیز اللغات ص ا سے ص ۲

تالیفات اور تصنیفات ہیں۔ اُن میں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ یہ کتابیں گوشہ گمنامی میں پڑی ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ لغات المصادر[1] (غیر مطبوعہ) ۲۔ کشکولِ ادب (غیر مطبوعہ) ۳۔ تذکرۃ المعاصرین (غیر مطبوعہ) ۴۔ قواعدِ اردو (غیر مطبوعہ) ۵۔ متروکاتِ سخن (غیر مطبوعہ) ۶۔ منظوم ریڈر (مطبوعہ) ۷۔ گلزارِ ادب (مطبوعہ) ۸۔ حالاتِ فردوس آب (غیر مطبوعہ) ۹ حالاتِ حضرت آہر لکھنوی (مطبوعہ)

شروع کی چار کتابوں کا حوالہ "گلکدۂ عزیز" کے دیباچہ میں موجود ہے دیباچہ نگار جناب رحم علی الہاشمی (تلمیذ عزیز) سے راقم نے علی گڑھ میں ملاقات[2] کی اور مذکورہ کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو موصوف نے فرمایا:۔

"میں نے ان کتابوں کو نہیں دیکھا ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ کہاں مل سکتی ہیں۔ جناب عزیز نے خود ان کتابوں کے بارے میں مجھے بتلایا تھا، لہٰذا میں نے اپنے دیباچہ میں ان کا تذکرہ کر دیا تھا"

کتاب نمبر پانچ کے متعلق اس وقت معلوم ہوا جب سید ابوالحسن صاحب کاظمی سے محمود آباد اسٹیٹ (ضلع سیتاپور) میں ملاقات ہوئی۔ اس تصنیف کے بارے میں جو کچھ وہ بتلاتے گئے میں لکھتا گیا۔ نقل ملاحظہ فرمائیے:۔

"میں بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین کتب خانۂ محمود آباد میں کام کرتا تھا۔ عزیز صاحب کا ماتحت تھا۔ مرحوم مجھ سے بہت شفقت فرماتے

---

[1] مکاتیب اکبر خط نمبر ۷۰ (مصادر اردو کی یکجائی کا خیال رکھیے)" اور دیباچہ گلکدۂ عزیز

[2] زبانی رحم علی الہاشمی (بمقام علی گڑھ)

تھے۔ اور اسی سلسلہ میں اپنی ایک تصنیف نو جس کا نام انھوں نے "متروکاتِ سخن" رکھا تھا۔ میرے ذریعہ مرتب فرماتے رہے جو خدمت مجھ سے ہو سکی وہ میں نے کی اور اس کا اتنا حصہ میں نے خود ترتیب دیا جو ایک کتاب کی شکل میں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں بقیہ مسودات مرحوم کے پاس اور تھے اور جن کا ذکر انھوں نے مجھ سے کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرضِ ذیابطیس میں بری طرح مبتلا تھے اور ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ مرتبہ جزو اور جو مسودات ان کے پاس باقی تھے وہ لکھنؤ لے کر چلے گئے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک نایاب کتاب ہوتی مگر افسوس ہے کہ منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس تصنیف میں متروک اور مستعمل الفاظ پر مدلل بحث تھی مجھ کو ایک شعر غالب کا یاد رہ گیا ہے جو مثال کے طور پر مرحوم نے "تو" اور "سو" کے متعلق لکھا تھا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اس میں لفظ "سو" کی نشست پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر "سو" متروک کو نکال کر "تو" مروج کو رکھ دیا جائے تو حسنِ شعر باقی نہ رہے گا۔ ازیں قبیل بہت سی مثالیں تھیں جو اب اس وقت یاد نہیں رہیں۔ اس کتاب کے علاوہ انھوں نے اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا کافی ذخیرہ جمع کر کے کلیات کی شکل قائم کی تھی جو میرے علم میں طبع نہیں ہوا۔[1]

---

[1] سید ابوالحسن صاحب کاظمی کا تحریری بیان بتاریخ ۷ نومبر ۱۹۷۵ء بمقام محمود آباد اسٹیٹ (سیتاپور)

کتاب نمبر چھ، سات اور آٹھ کا اندراج تو کتب خانہ محمود آباد کے رجسٹر میں ہے مگر کتابیں گم ہیں۔ آخری کتاب کا حوالہ "معیار"[1] ماہوار سے ملتا ہے۔

مضامین:۔

ان تصنیفات کے علاوہ آپ نے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں جن سے معتبر اور مستند جرائد و اخبارات مالامال ہیں۔ جو مضامین میں نے دیکھے اُن کو معہ حوالہ ماخذ ذخیرہ کر لیا ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ عزیز صرف اچھے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے اور اُن کی نثری خدمات بھی بکثرت ہیں۔

خطوط نگاری[2]:۔ خطوط نگاری بھی ادبیات کی ایک نمایاں صنف ہے۔ مغربی ادبیات میں تو خطوط نثر کے بہترین کارنامے سمجھے جاتے ہیں اردو میں بھی خطوط غالب کی اشاعت کے بعد اس صنف کی ادبی اہمیت مسلم ہو گئی۔ عزیز نے بھی اس صنفِ ادب کے تقاضوں کو خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ اگر عزیز کی خطوط نگاری کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی شخصیت اور ادبی قامت کی وضاحت میں کمی رہ جائے گی۔ اسی لیے انکے خطوط پر بھی ہلکی سی روشنی ڈالنا ضروری ہے

خطوط نگاری:۔

عزیز نے اپنے احباب اور تلامذہ کو کافی خطوط لکھے ہیں جن میں اکبر

---

[1] رسالہ "معیار" ماہوار (لکھنؤ) اگست ۱۹۱۰ء سے دسمبر ۱۹۱۰ء تک آخری صفحہ پر تصنیف کا اشتہار۔

[2] مکتوبات عزیز مرتبہ محمد یٰسین تسکین سورونوی مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۳ء

جوشؔ، اثرؔ، عبدالماجد، شوقؔ قدوائی، شیخ عبدالقادر اور سید سلیمان ندوی وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔ عزیزؔ کے خطوط القاب و آداب، خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی اور زوائد کے فضول اور فرسودہ طریقوں سے پاک و صاف ہیں۔ عبارت نہایت سادہ سلیس اور بے تکلف ہے۔ عزیزؔ اپنے مکتوب الیہ سے اصلاحِ کلام، ادبی نکات، عصری حالات، مخصوص واقعات اور شعر و شاعری کے متعلق قلم کی زبان سے باتیں کرتے ہیں۔

ہر چند کہ ان کے خطوط اسلوب کے نقطۂ نظر سے متوجہ کرنے والی انفرادیت سے بالعموم خالی ہیں مگر اُن کی علمی اور معلوماتی اہمیت بہرحال ہے۔ ان کے خطوط کا مطالعہ کرنے والا اُن میں اور اُس بے تکلف اور دلآویز کیفیت و فضا کو تو محسوس نہیں کر سکتا۔ جو غالبؔ کے یہاں نظر آتی ہے پھر بھی یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اُن کے خطوط میں غالبؔ کے اثرات جابجا موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر عزیزؔ کے ایک خط کا عکس منسلک کیا جاتا ہے۔

باب پنجم

عزیز کا نظریۂ شعر و فن

شاعری کے متعلق عزیز کے نظریات

ابتدا میں اردو ادب سے متعلق جو نظریات تھے وہ بہت محدود تھے۔ ادب محض امراء و سلاطین کو خوش کرنے کا ذریعہ تھا۔ شاعر اور ادیب کسبِ معاش کے لئے درباروں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ادب صرف جمالیات سے متعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ فن کے ظاہری نقش و نگار ہی کو معیار نقد و نظر سمجھا گیا۔ قافیہ ردیف، اوزان، بحور، تشبیہ و استعارہ، زبان و محاورہ اور تخئیل و مبالغہ وغیرہ پر ہی فن کا دارومدار تھا۔ شاعری فنکاری سے زیادہ مرصع سازی تھی اردو کے تذکروں میں انھیں نظریات کے تحت شعراء کے کلام کا جائزہ لیا گیا

ہے، مواد، موضوع اور معنوی خوبیاں زیادہ قابلِ توجہ نہیں تھیں۔ یہ کیفیت اردو ادب پر اس وقت تک طاری رہی جب تک ہندستان میں جاگیردارانہ نظام قائم رہا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہندوستان میں ایک سیاسی انقلاب آنا شروع ہوا۔ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان پر انگریزوں کا باقاعدہ تسلط ہو گیا۔ جاگیرداروں کی مرکزیت ختم ہوئی۔ درباروں کی زبوں حالی دیکھ کر فن کاروں کا رخ عوام کی طرف ہوا۔ ملک ایک نئی کش مکش میں مبتلا تھا یہ تہذیب و روایات کی کش مکش تھی، نئی زبان، نئی تہذیب اور نئے طرزِ زندگی کا رد و قبول ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ ہندوستانیوں میں نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے تھے کچھ لوگوں کو اپنی فلاح کے سارے امکانات صرف مغرب کی تقلید میں دکھلائی پڑ رہے تھے اور کچھ اپنی تہذیبِ قدیم ہی کو اپنی زندگی سمجھ بیٹھے تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اعتدال کا راستہ اپنایا۔ ان لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ اپنی پرانی تہذیب قائم رکھتے ہوئے اپنے کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر لیا جائے۔ پرانے طرز کے ساتھ ساتھ نیا طرز بھی اپنایا جائے۔ جدید رنگ کی تائید کرتے ہوئے یہ لوگ قدامت پسند رہے ان کی غرض یہ تھی کہ اردو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جائے کہ اس میں جدید رنگ بھی شامل ہو۔ پرانے رنگ کا تصنع اور تکلف جاتا رہے۔ نئے نئے موضوعات کو داخل کیا جائے۔ مبالغے، اور دور از کار تشبیہیں ترک کی جائیں، سلاست و سادگی کے ساتھ تجربات و واقعات کی سچی تصویریں پیش کی جائیں۔ اس اصلاح کے بانی حالی، شبلی اور آزاد تھے۔ ان کے نظریات سے استفادہ کرنے والوں میں اسمٰعیل، رسوا، اقبال، حسرت، چکبست، اور صفی وغیرہ کے ساتھ عزیز لکھنوی بھی

تھے۔ عزیز نے بھی جدید اور قدیم دونوں طرزوں کی خوبیوں کو اپنا کر اپنے تصورات پیش کیے اور انھیں پر اپنے فنی کارناموں کی بنیاد رکھی۔

شاعری کیا ہے؟ شعر کسے کہتے ہیں اور شاعر کو کیسا ہونا چاہیئے؟ ان موضوعات پر عزیز نے اپنے خیالات کبھی نظم اور کبھی نثر کی صورت میں پیش کیے۔ یہ خیالات مختلف مضامین اور مقدمات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں پر اُن کے انھیں منتشر خیالات و نظریات کو یکجا کیا گیا ہے۔

عزیز نے شاعری کی بہت سی تعریفیں لکھی ہیں، جن کا اختصار یہ ہے کہ شاعری جذبات و احساسات کے اظہار کا طریقۂ موزوں، ایک ذوقی اور وجدانی چیز، مطالعہ النفس کا نتیجہ، مصوری یا نقالی، صداقت اور راستی ہے۔ عزیز لکھتے ہیں:۔

"محققین نے شعر کے مفہوم کو نہایت وسیع ثابت کیا ہے وہ اس کا تعلق صرف تخئیل سے بتلاتے ہیں۔ اسی سے موزونیت، ناموزونیت کی قید کو بھی اٹھا دیا ہے اور یہیں سے شاعر کا فطری اور شعر کا غیر اکتسابی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس مقام پر اپنی ایک نظم درج کرتا ہوں اس سے شعر کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے"[1]

یہ نظم اکتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ کچھ شعر درج ذیل ہیں:۔

شاعری کیا ہے؟ فقط اک جذبۂ طوفاں خروش	قوتِ تخئیل میں اک ولولہ انگیز جوش
شاعری کیا ہے؟ فقط تصویرِ جذباتِ نہاں	قوتِ تخئیل کے ہمراہ تاثیرِ زباں
وارداتِ قلب کی تغیرِ طولانی ہے یہ	اک مجسم ہستئ اغراضِ نفسانی ہے یہ

---

[1] تجلیات صـ۲۸۱

دل یہ ہو جس وقت قدرت کے مناظر کا اثر
منھ سے کچھ باتیں نکل جائیں اثر میں ڈوب کر

اک خلاصہ تھا وہ اس کے درد کی تفصیل کا
جب کہا تھا مرثیہ قابیل نے ہابیل کا

رزم کی یہ روح ہے اور بزم کی یہ جان ہے
عشق کا قرآن ہے اور حسن کا ایمان ہے

اس کے گلدستوں سے زینت ہے نشاطِ بزم میں
دل کو زریوں پر بنہا دیتی ہے دشتِ رزم میں

غیر محسوسات کا ادراک کرتی ہے یہی
تخلیہ میں سیرِ ہفت افلاک کرتی ہے یہی

ظلمت اس کی شام گیسو صبح اس کی صبحِ عید
طبعِ قدرت کا لطیفہ قلبِ فطرت کی امید

شاعری کی اب تک جتنی تعریفیں ہوئی ہیں عزیز نے تقریباً سب نظم کر دیں رومانی ادیب کی طرح عزیز بھی مناظرِ قدرت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ :-

"مناظر قدرت کی تعریف جن الفاظ میں بیان ہو سکتی ہے وہی لفظیں شعر کی تعریف کے لیے کافی ہیں[1]"

حکیم افلاطون کی طرح عزیز بھی شاعری کو بے انتہا طاقت ور کہتے ہیں اس میں اتنی طاقت ہے کہ مردنی کو تازگی میں بدل دیتی ہے۔ خوابیدہ کو جگا دیتی ہے۔ روح میں تڑپ پیدا کر دیتی ہے۔ میدانِ جنگ میں سپاہی کو جانبازی سکھاتی ہے۔ عزیز کا یہ بھی خیال ہے کہ نظم میں یہ تاثر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ارکانِ معینہ اور اصولِ عروض کی پابندی کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"میں اس بات پر اکثر غور کرتا ہوں کہ ایک ایسا مضمون جو نثر میں بیان کیا جائے ہرگز ایسا اثر نہیں پیدا کرتا جتنا نظم ہو کر موثر ہوتا ہے، خدا جانے ان ارکان معینہ اور اصولِ عروض میں کیا خاص تاثر ہے[2]"

---

[1] "روحِ رواں" ص ۲

[2] رسالہ معیار حصہ ۳ بابت اپریل ۱۹۱۱ء

شبلی کی طرح عزیز بھی محاکات کو شاعری کا کمال تصور کرتے ہیں۔ اس کے محاکاتی عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"کسی حکیم نے خوب کہا ہے کہ اگر کسی مخلوق کو خالق کہہ سکتے ہیں، تو وہ شاعری ہے جو اپنے محسوسات کو خلعتِ جسمانیت دیکر ایسے الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ اُن کی تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ شاعری کا کمال یہ ہے کہ غیر مرئی چیزوں کو اس انداز سے بیان کردے کہ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جائے"[۱]

شاعری پر عمیق نظر ڈالتے ہوئے عزیز کہتے ہیں کہ شاعری تین قسم کے جذبات طبعی پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں کیفیتیں شاعر کے دل و دماغ اور اُس کی طبعی سرشت کے حسب استعداد قابلیت اُس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ عزیز نے جذبات کی تقسیم اس طرح کی ہے:[۲]

۱۔ پہلا ملکہ وہ ہے جو مظاہر و مناظرِ قدرت کے نظارے سے جذبات باطنی کو جھنجھوڑتا ہے۔

۲۔ دوسرا ملکہ دماغی قوتوں اور مدرکات حسیہ سے فراخور استعداد پیدا ہوتا ہے

۳۔ تیسرا اور سب سے بلند ملکہ اس مقام پر ہے جہاں مبدء فیاض سے حقائق و معارف کی جلوہ گری شروع ہوتی ہے اور یہ درجہ انتہائے معرفت ہے۔

جذبہ کی انھیں کیفیات سے عزیز شعر و شاعری کے مدارج بھی قائم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جذبات کے نظم کرنے میں اگر شاعر جذبہ کی تینوں کیفیتوں پر

---

[۱] تجلیات ص ۲۸۳

[۲] ایضاً ص ۲۸۳ ص ۲۸۴

عبور رکھتا ہو تو اس کا شعر بلندی کی انتہا پر ہوگا۔

شاعری کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اسی لئے شاعری کو مطالعۂ نفس کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ عزیزؔ اس بات کے قائل ہیں کہ شاعری کا تعلق ذات سے ہے نوع سے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے لسان العصر حضرت اکبرؔ مرحوم سے ایک مرتبہ یہ خیال ظاہر کیا کہ میں شعر فقط اپنے دل کے خوش کرنے کے لئے کہتا ہوں۔ اس جملہ کی انھوں نے اس قدر قدر کی کہ ایک قطعہ کی صورت میں نظم کیا۔[1] قطعہ پیش ہے۔

نہ میرے لئے اور نہ تیرے لئے — نہ اشعار یہ ہیں صلے کے لیئے

بہت خوب ہے قولِ ہادی عزیزؔ — کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

عزیزؔ نے اصنافِ شاعری پر بھی اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ غزل کے لئے انھوں نے سوز و گداز اور درد و غم کو لازمی قرار دیا ہے۔ عزیزؔ کو غزل میں دونوں جہان کی وسعتیں نظر آتی ہیں جبکہ کچھ لوگوں نے اس کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا ہے۔ اس صنفِ سخن کو عزیزؔ آسان اور مشکل سے مشکل کہتے ہیں۔ لکھنؤ میں جس قسم کی غزل گوئی کا رواج تھا عزیزؔ نے اُس راستہ سے ہٹ کر غزل گوئی کی۔ یہی نہیں کہ ان کی غزلوں میں ایک والہانہ پن ہے بلکہ زندگی کے حقائق بھی نظم کر دیئے ہیں۔ نظم کو عہدِ جدید کی پیداوار بتلایا ہے اور اس لئے تسلسل، روانی اور تخئیل کی بلندی کو لازم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"اب زمانہ نے نئی کروٹ لی۔ ہر چیز نے نیا روپ بدلا۔ شاعری کے لئے نئے سانچے نکلے۔ دورِ جدید کے جدت پسند شعراء نے نظموں پر

---

[1] روحِ ریزاں صفحہ ۱ (یہ قطعہ مکاتیب اکبرؔ کے ضمن میں بھی درج کیا جا چکا ہے۔ یہاں پر بھی ضروری معلوم ہوا لہٰذا مکرر درج ہے)

زیادہ توجہ کی اور مختلف مضامین پر خامہ فرسائیاں ہونے لگیں
مگر تسلسل روانی اور تخئیل کی بلندی ہر شاعر کی نظم میں مشکل سے
ملے گی"[1]

رباعی پر کچھ تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ بحر اور اوزان سے بحث کی ہے۔ رودکیؔ کو رباعی کا موجد اور اسے معراج کمال تک پہونچانے کا سہرا عمر خیامؔ کے سر پہ باندھا ہے۔ وہ اس میں اتنی وسعت دیکھتے ہیں کہ دنیا کا ہر مضمون اس میں ادا ہو سکتا ہے اور تاثیر میں ہر صنف سخن سے زیادہ تصور کرتے ہیں۔ رباعیاتِ انیسؔ و دبیرؔ سے زیادہ حالیؔ کی رباعیوں کو پسند کرتے ہیں کیوں کہ انیسؔ و دبیرؔ کی بدولت رباعیوں کا ایک مختصر ذخیرہ تو ضرور جمع ہو گیا ہے مگر ان میں تنوعِ مضامین نہیں اور دائرۂ فکر بھی محدود ہے۔ انھوں نے حالیؔ کے علاوہ مستقل کوئی مجموعۂ رباعیات ایسا نہیں دیکھا جس نے شہرتِ قبولیت حاصل کیا ہو۔

عزیزؔ نے اصناف کے صرف تخئیلی پہلو پر ہی روشنی نہیں ڈالی بلکہ انکی زبان کے متعلق بھی اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"غزل کی زبان نہایت سلیس اور روزمرہ ہو۔ توالیِ اضافات اور غیر مانوس الفاظ سے کلام کو محفوظ رکھو۔ ہاں قصیدہ میں آزاد ہو۔ جزالت و شوکتِ الفاظ سے کام لو۔ مثنوی میں واقعہ نگاری کی حیثیت ملحوظ رکھو۔ مثلاً کسی واقعہ کو نظم کر رہے ہو تو مخاطب اور متکلم کی زبان کا خیال رکھو۔ جس طبقہ کا آدمی ہو ویسی ہی

---

[1] روحِ رواں ص۱۲

زبان بھی ہو"[1]

شعر میں کچھ لوگ خیال کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور کچھ زبان کو، کچھ لوگ معنی پر زور دیتے ہیں اور کچھ الفاظ پر۔ عزیز نے زبان کی اہمیت سے تو کبھی انکار نہیں کیا مگر معنی پر زیادہ توجہ صرف کی۔ وہ کہتے ہیں:۔

" لوگ صرف الفاظ پر نظر کرتے ہیں۔ معانی سے کوئی غرض نہیں رکھتے۔ الفاظ میں شوکت و جزالت، ترکیبوں کی ندرت ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ سلیس صاف پر لطف شعروں کی بعض شاعروں میں داد نہیں ملتی۔ مرصع پیچیدہ اور لغو شعر پر ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔.. شاعری کا ایک دور ایسا تھا جس میں رعایتِ لفظی اور مراعاۃ النظیر کی بھرمار تھی۔ تشبیہات و استعارات کی کال کوٹھری میں معنی کو قید کرتے تھے"[2]

شعر کے معنوی پہلو کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے عزیز نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر شعر معنوی حیثیت سے خراب ہو تو قلم زد کرنا چاہیئے[3] ان کے خیال میں الفاظ کو مضمون کا تتبع کرنا چاہیے وہ الفاظ کو بھی اس لئے اہم سمجھتے ہیں کہ وہی مضمون کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ اس ضمن میں عزیز شعر العجم حصہ اول سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ حسان بن ثابت کے ایک چھوٹے بچہ کو کیڑے نے ڈنک مار دیا۔ باپ کے پوچھنے پر وہ کیڑے کا نام تو نہ بتا سکا مگر کہا کہ جس کیڑے نے کاٹا ہے وہ دھاری دار

---

[1] مشاطۂ سخن ص۱۴

[2] " " ص۶

[3] " " ص۱۳

چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ باپ سمجھ گیا کہ بچہ کو جھڑنے کاٹا ہے۔ اب عزیزؔ کہتے ہیں کہ یہاں الفاظ اور تشبیہہ نے اصل معنی کی طرف متوجہ کیا الفاظ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ شبلیؔ کا قول دہراتے ہیں کہ مضمون کی خوبی پر خراب بندش نقاب ڈالتی ہے۔ لفظ و معنی کی اہمیت کے علاوہ عزیزؔ شعر کی خوبی کا دارومدار بہت کچھ ردیف قافیہ پر بتلاتے ہیں۔ ردیف کو وہ اتنا زوردار بنانے کے قائل ہیں کہ اگر ردیف کو نکال دیا جائے تو شعر بے معنی ہو جائے اور قافیہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ:-

"قافیہ سے مضمون پیدا کرنا چاہیئے۔ بعض شعرا مضمون سوچنے کے بعد قافیہ تلاش کرتے ہیں۔ اس لئے شعر سُست ہو جاتا ہے" [1]

وہ اس بات کے قائل نہیں کہ قافیہ سے مضمون پیدا کرنے میں شعر آورد کا شکار ہو جاتا ہے۔ شعر میں اس وقت زیادہ جاذبیت ہوتی ہے جب خیال اپنے فطری انداز میں نظم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے عزیزؔ کے محترم مرزا رسوا قافیہ سے مضمون پیدا کرنے کے قائل نہیں تھے مگر عزیزؔ اس معاملہ میں مرزا کے ہم خیال نہیں۔ رسواؔ کہتے ہیں:-

"ہماری شاعری مصوری نہیں، نہ ہم خارج کی تصویر کشی کرتے ہیں نہ نیا مضمون پیدا کرتے ہیں بلکہ محض قافیہ سے مضمون پیدا کرتے ہیں۔ نفس مضمون اور انداز بیان دونوں حیثیتوں سے ہمارا انداز محض تقلیدی اور روایتی ہے۔" [2]

---

[1] مشاطۂ سخن صہ ۱۴

[2] مرزا کے تنقیدی مراسلات صہ ۲۴

ردیف اور قافیہ کی پابندی میں عزیز قدیم کی پیروی کرتے ہیں مگر موضوعات کے سلسلے میں اچھے خاصے جدت پسند ہیں۔ ایک مشاعرے میں وہ شعرا کو مدعو کرتے ہوئے غزل میں نئے موضوعات نظم کرنے کی اُن سے اس طرح فرمائش کرتے ہیں۔

"گل و بلبل کی پرانی دُھرانی کہانیاں دہراتے دہراتے دم اکتا گیا علمی معلومات کا ذخیرہ اور فطری قوت کا سرمایہ جو آپ کے دل و دماغ میں ودیعت ہے اُس سے کام نہ لینا بڑا ظلم ہے۔ یہی زمانہ ہے کہ آپ اس کو ظاہر کریں اور کسی علمی بحث پر عام اس سے کروہ تاریخی ہو یا تمدنی، اخلاقی ہو یا ادبی یا کسی صنف حکمت سے تعلق رکھتا ہو تصنیف فرما کر وقت پر شریک صحبت ہوں"[1]

قواعدی شاعری کی ایک قید یہ بھی ہے کہ شعر بالقصد موزوں کیا جائے[2] عزیز نے بھی شعر گوئی کے لئے اس قید کو لازم قرار دیا، ورنہ اگر شاعری عطیۂ فطرت ہے تو ارادے یا تعمد کی قید و بند واجب نہیں عطیہ فطرت کے لئے انسان کے ارادوں کی پابندی ضروری نہیں۔ اسی سے شعر میں آمد اور آورد کی بات چل نکلتی ہے۔ آورد کے شعر میں فلسفیانہ بالغ نظری تو ہو سکتی ہے مگر روح کو تڑپا دینے والا حسن مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے جو آمد کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

عزیز نے شعر گوئی کے لئے تبحّر علمی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علم سے فلسفیانہ خیالات اور حکیمانہ افکار ذخیرہ ہوتے ہیں۔ اگر شاعر

---

[1] معیار (لکھنؤ) اکتوبر ۱۹۰۹ء ص ۲۱

[2] معیار (لکھنؤ) اپریل ۱۹۰۸ء ص ۶

کے پاس معلومات کا ذخیرہ نہیں ہے تو اس کے شعر میں گہرائی اور آفاقیت نہیں پیدا ہوسکتی، محدود خیالات اور سطحی نظر سے شعر میں سطحیت آجاتی ہے وہ شاعری اور حکمت دونوں کو ہم پلہ سمجھتے ہیں حکمت کا دارومدار علم پر ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے بڑی دشوار گذار راہیں طے کی۔ اس طرح شعرگوئی کے لئے اول علم کو پھر موزونی طبع کو لازم قرار دیتے ہوئے عزیز کہتے ہیں:۔

"شاعر کے لیے بڑے معلومات کی ضرورت ہے۔ یہی وہ فن ہے جو منتہائے علوم ہے۔ اس کے بعد بھی ایک مشکل ہے بالفرض مان لیا جائے کہ کوئی شاعر تمام علوم وفنون پر حاوی ہے پھر بھی خداداد طبیعت کی ضرورت ہے۔ شاعر کسی سے شعر کہنا نہیں سیکھتا وہ محض اپنے ذوق سلیم اور طبیعت خداداد کا شاگرد ہوتا ہے [۱]"

اسمیں تو کوئی شک نہیں کہ آج شاعری اور شاعر کی وہ عزت نہیں جو کبھی تھی۔ اس کے بہت سے وجوہ ہوسکتے ہیں جن میں ایک لازمی وجہ یہ ہے کہ شاعری کے متعلق یہ خیال بہت عام ہونے لگا کہ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے۔ اس میں علم کو کوئی دخل نہیں۔ اکثر صاحبان علم ایک شعر بھی موزوں نہیں کر پاتے اور ایک جاہل بڑی آسانی سے اشعار نظم کر لیتا ہے۔ اس خیال کے تحت جو لوگ شاعری کے لئے علم کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے عزیز کے خیال میں وہ وفور جہالیت سے خودپرستی کا آئینہ سامنے رکھے ہوئے اپنے محاسن آپ ہی دیکھا کرتے ہیں تعصب و تمرد اُن کا شعار اور کج بحثی اُن کی عادت۔ مولوی امداد امام اثر بھی شاعر کے لئے تحصیل علوم لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

---

[۱] معیار اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۸

.... بغیر پر مادگی اور دفورِ استعداد کے کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا[۱]

شاعری کو زوال سے بچانے کے لئے عزیز نے شاعروں کے لیے جو باتیں ضروری قرار دی ہیں۔ اُن سے بھی اُن کے نظریاتِ فن کی وضاحت ہوتی ہے مثلاً خیال کی آزادی، احساسات کا جلد مشتعل ہونا، مشاہدہ تیز ہونا، غور و فکر کرنا، بے زبان پیکروں سے باتیں کرنا۔ سطحی نظر سے کسی چیز کو نہ دیکھنا جذبات و خیالات کو تشبیہات اور استعارات کے رنگین پیرایوں میں ظاہر کرنا محسوسات اور مدرکات کو دل پذیر اور مو ثر طریقہ سے قالبِ نظم میں ڈھالنا مظاہر و مشاہدات کی مصوری کرنا، شواہد و استدلال سے دعوٰی کی مضبوطی ثابت کرنا اس کے دماغ کا عالم ناسوت و ملکوت کی سیر کرنا۔ مشتعل جذبات پر کامل دستگاہ ہونا۔ حسبِ دلخواہ لوگوں کو ہنسانا یا رُلانا اور اپنے جذبات اور زادۂ فکر مضامین کو حسبِ خواہش نظم کر لینا وغیرہ ایسی ضروریاتِ شعری ہیں جن سے ترازوئے شعر کا پلہ گراں ہو جاتا ہے۔

عزیز نظرتاً قدامت پسند تھے وہ شاعری کے قواعدِ معینہ سے باہر قدم رکھنا نئے الفاظ و محاورات وضع کرنا یا متقدمین کی راہ سے انحراف گوارہ نہیں کرتے تھے۔ عزیز شہر لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ بقول رشید احمد صدیقی، قدیم سے جدید کی طرف آنے پر سب سے کم تیار یا رضامند تھا[۲] ۔ وہ اصولِ فن سے بے راہ روی برداشت نہیں کرتے تھے اور صاف الفاظ میں اظہارِ ناراضگی کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں ہر شاعر خود و علومِ ادبیہ سے

---

[۱] کاشف الحقائق ص ۲۲

[۲] ہزار داستاں کے تنقیدی مراسلات ص ۹ (الف)

بے خبر رہتے ہوئے بھی مدعی استادی ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مرکز ہے اور نہ کوئی امتیاز۔ وہ آزاد خیال ہے اور قواعد و محاورات وضع کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس قسم کے شعرا پر عزیزؔ اعتراض اور طنز کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ عزیز لکھتے ہیں:۔

"آج کل خود رو شعرا کی وہ جماعت جس نے مغربی چشموں سے اپنی پیاس بجھائی ہے فن اور اصولِ فن کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں ان کی آزادی متقدمین کی تقلید گوارہ نہیں کرتی عربی علوم حاصل کرنے کے بعد شعر کا میدان ابھی اُن کے نزدیک اتنا ہی فراخ ہے جتنا فٹ بال یا ہاکی کا۔"

اگر فن اور فنکار سے متعلق عزیزؔ کے نظریات کا تجزیہ کیا جائے تو زیادہ تر وہ روایتی نظر آئیں گے۔ کہیں کہیں وہ اپنے ماحول سے بھی متاثر ہیں کبھی حالیؔ سے تو کبھی شبلیؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کبھی مرزا محمد ہادی رسواؔ سے تو کبھی مولوی امداد امام اثرؔ سے اثر قبول کرتے ہیں۔ مثلاً شاعری کے اصول اور قواعد معینہ سے ہٹ کر کسی اختراع کے قائل بھی نہیں ہیں اور شاعری میں نئے نئے موضوعات داخل کرنے کے حامی بھی ہیں۔ وہ خیال اور صورت شعر کے دونوں پہلوؤں کو اہم سمجھتے ہیں۔ سلاست اور اصلیت کو پسند کرتے ہیں۔ مبالغہ سے نفرت ہے۔ مضمون کی اہمیت پر نگاہ ہے مختلف خیالات کے لئے مختلف اصنافِ سخن کے قائل ہیں۔ شاعری کو امورِ ذہنیہ اور واردات قلبیہ کا بیان جانتے ہیں۔ قریب قریب اسی قسم کے نظریاتِ فن عزیزؔ کے دیگر معاصرین کے بھی تھے جدید تنقید کے

لہ مقدمہ بر "روحِ رواں"

بانی۔ آزاد، حالی اور شبلی کے نظریات و تصورات اردو ادب پر پوری طرح مسلط ہو گئے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے ان تصورات میں زیادہ وسعت پیدا کر دی مگر اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب عزیز اس دار فانی سے گذر چکے ہیں۔ مجموعی طور پر شعر کے متعلق ان کا نظریہ ایک ایسی تاثراتی بنیاد رکھتا ہے جس میں حکیمانہ رنگت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

تنقیدی شعور:۔ عزیز کے نظریاتِ فن کا جائزہ لینے کے بعد اب اُن کے تنقیدی شعور کو بھی دیکھنا ہے۔ تنقید کے دو شعبے ہیں۔ ایک کا تعلق اصول و نظریات سے ہے اور دوسرے کا عمل سے۔ ذیل میں عزیز کے وہ خیالات درج کئے جاتے ہیں جو تنقید کے اصول و نظریات سے متعلق ہیں۔

۱۔ تنقید اگر نیک نیتی اور انصاف سے ہو تو بے منتِ استاد فائدہ حاصل ہوتا ہے[1]

۲۔ ناقد کو ان مشاہدات و تجربات کا پتہ لگانا چاہیے جن کے زیر اثر شعر کی تخلیق ہوئی ہے اس اصول کو ایک شعر[2] میں عزیز نظم کر دیتے ہیں۔

۳۔ ناقد کے لیے شعر کی لطافتوں تک رسائی پھر اس کے اظہار پر قدرت ضروری ہے[3]۔ ظاہر ہے کہ ناقد اگر سخن فہم نہیں ہے تو شعر کے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو سکتی اور ایسی حالت میں جو رائے شعر

---

[1] گلکدہ صد ۲۱

[2] گلکدہ صد ۹۰: پھر سنوں شوق سے میں تیری نصیحت ناصح ٭ دیکھ ہر کلام مرا میری کہانی سے پہلے

[3] انجمنستان صد ۱۴

پر قائم کی جائے گی وہ غلط ہوگی۔ اگر اس کے پاس قوتِ اظہار نہیں تو اپنی بات دوسروں کو سمجھا نہیں سکتا اس لیے عزیز نے تنقید کو بہت مشکل کام قرار دیا ہے۔

وہ کہتے ہیں:۔

کلام پر تنقید اور ہر شاعر کی خصوصیات کا انکشاف دشوار کام ہے۔ خصوصاً میرے لئے جس کو فرصت عنقا ہے۔[1]

شاید یہی وجہ ہے کہ نظریاتِ فن یا تنقید پر عزیز کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس مشکل کام کو انجام دیتے۔

(۴) تنقید میں مروت محبت اور رواداری سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جھوٹی تعریف سے شاعر کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ کلام اپنی اصل قیمت بھی کھو بیٹھتا ہے عزیز کا یہ خیال درست ہے کہ کلام پر نقد و نظر کا قدیم طریقہ سطحی تھا۔ وہ اپنے زمانہ کو بہت روشن خیال بتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب زمانہ کی نظر کلام کی تہ تک پہونچ جاتی ہے اور عہدِ جدید میں مصنوعی تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عزیز مصنوعی تنقید کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"یاوہ گوئی اور مدح خوانی کے لایعنی دفتر کھولنا بے سود ہے، اس لیے کہ اب وہ روشن عہد ہے جس میں مغزِ کلام تک دوربین نگاہیں پہونچ جاتی ہیں اور بال کی کھال کھینچ لیتی ہیں ملمع کاری یا حقیقت پر مصنوعی نقاب ڈالنے والے گندم نما جو فروش سمجھے جاتے

---

[1] انجمستان ص ۲۰

ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کلام اپنے اصلی وزن سے بھی کم نظر آنے لگتا ہے اور شاعر کی دماغی قوتوں کا اعتدال بہت جلد فنا ہو جاتا ہے[۱]۔

انھیں نظریات کے تحت عزیز نے تنقید نگاری کا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کے عہد میں اردو تنقید اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ آج جیسی ترقی یافتہ شکل نہیں تھی۔ لہٰذا ان کی تنقید میں زیادہ وسعتِ نظر اور جدتِ فکر کو تلاش کرنا بیکار ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں (جو مضامین یا مقدمات کی شکل میں ہیں) اپنے معاصرین شبلی نعمانی، ماہر لکھنوی جگر لکھنوی، احسن لکھنوی، جدید لکھنوی، جلیل، حسرت موہانی، وحشت کلکتوی، شاکی میرٹھی اور اکبر الہ آبادی کے کلام کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے اور مرزا محمد ہادی رسوا نیز اپنے تلامذہ رواں اناوی اور اثر لکھنوی کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ رواں نے جن اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی عزیز نے ان سب کا الگ الگ جائزہ لیا ہے۔ رواں کی نظم گوئی پر صاف صاف لکھتے ہیں:۔

"روحِ رواں" کے حصۂ اول میں کل تیس نظمیں ہیں۔ ابتدائی زمانہ کی بعض نظمیں مصنف نے خارج کر دیں۔ اس میں بھی اکثر نظمیں حذف کر دینے کے قابل تھیں کیوں کہ کوئی خاص خصوصیت ان میں نہیں بلکہ اکثر خامیاں بھی موجود ہیں جن پر خود مصنف نے بھی نظرِ ثانی نہیں کی ہے[۲]۔

• جو کلام مستحقِ تعریف تھا اس کی کھل کر تعریف کی "شاعری" کے عنوان

---

[۱] مقدمہ روحِ رواں ص ۱۱

[۲] ایضاً ص ۱۲

سے رواںؔ کی ایک مختصر سی نظم ہے۔ عزیزؔ نے جس کو بہت پسند کیا ہے۔ اُس کو نہایت پر مغز بتلایا ہے۔ الفاظ کی نشست اور مصرعوں کی بے ساختگی اور اس کے ساتھ روانی اور جوش و خروش کی بڑی تعریف کی ہے۔ عزیزؔ نظمیات رواںؔ کی خامیوں کا مجمل تذکرہ کرتے ہیں۔ ناقد کی صاف گوئی کے ساتھ فنکار کی فراخ دلی بھی قابلِ داد ہے جس نے اس تنقید کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور روح رواں کی زینت بنایا۔ درحقیقت یہ عزیزؔ کے خلوص اور ہمدردی کا نتیجہ تھا۔ فنکار یا شاعر ہمیشہ اس تنقید کی قدر کرتا ہے جس میں خلوص، ہمدردی، انصاف اور محبت ہو۔ چونکہ عزیزؔ کی تنقید میں یہ عناصر موجود تھے اسی لیے رواںؔ نے اسے قبول کرنے میں بجائے ذلت کے فخر محسوس کیا۔

عزیزؔ جب رواںؔ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اُن کو فلسفۂ اخلاق کے مسائل تغزل کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

رواںؔ کی غزلوں میں: کہیں تصوف کی عرفاں زار تجلیاں اور کہیں روحانی نغمے کہیں وجدانی ترانے جس کے ساتھ روانی و سلاست اور جوش و خروش، سوز و گداز کی بہتر سے بہتر تصویریں موجود ہیں۔[1]

ان خوبیوں کے بعد خامی بتلاتے ہیں اور وہ یہ کہ:-

"رواںؔ کی غزلوں میں فلسفہ کے خشک مسائل بھی نظم کر دیئے ہیں جن کو جذبات سے کوئی علاقہ نہیں جبکہ غزل خالص جذبات کی شاعری ہے۔ اس میں تغزل جذبات ہی کی کارفرمائی سے پیدا ہوتا

---

[1] مقدمہ "روح رواں"، صفحہ ۲۹

[2] ایضاً صفحہ ۳۰

ہے"۔

غزلوں کے بعد رباعیوں کا جائزہ شروع ہوتا ہے۔ فلسفیانہ خیالات، تخیل کی بلند پروازی، بندش کی چستی اور طرزِ ادا میں ندرت وغیرہ رواںؔ کی رباعیوں کا جوہر بتلاتے ہیں۔ باعتبارِ تنوعِ مضامین زبانِ اردو میں رواںؔ کی رباعیوں کو ایک خاص اضافہ بتلاتے ہیں۔ اصنافِ سخن کے ساتھ ہی رواںؔ کے موضوعاتِ شاعری اور ان کے اندازِ اظہار پر بھی عزیزؔ نے اپنے تاثرات سپردِ قلم کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"رواں نے جدید انکشافات، فلسفہ و سائنس کے مضامین بیشتر اپنے اشعار میں نظم کیے ہیں اور اس طرح نہیں جس طرح ایک فلسفی یا سائنداں مسائلِ حکمیہ بیان کرتا ہے بلکہ فلسفہ کے مسائل شاعری کی زبان سے ہیں رنگینی اور اثر ہر شعر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے پرانے فرسودہ خیالات سے یہ مجموعہ پاک و صاف ہے"[1]

رواںؔ کے کلام پر عزیزؔ کی عملی تنقید کی مثالیں اگر دیکھنا ہوں تو ناظرین "روحِ رواں" کا مطالعہ کریں۔

عزیزؔ جب کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو عام طور سے وہ کلام کے محاسن تو بیان کر دیتے ہیں مگر عیوب کو کھل کر بیان کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں یہ ناقد کی کمزوری ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے عزیزؔ خود کہتے ہیں۔

"اس مقدمہ میں رسمِ زمانہ کے مطابق میرا یہ فرض تھا کہ کلامِ رواںؔ کا دوسرا رخ بھی دکھاؤں کیوں کہ اس مجموعہ کو تنقیدی نظر سے اس

---

[1] مقدمہ "روحِ رواں" ص ۹

وقت میں دیکھ رہا ہوں جب طباعت کی صورت میں میرے سامنے ہے اس وقت سوا اس کے کہ خامیوں کا اعتراف کر لوں اور صورت نہیں خوبیوں کے اظہار کے بعد خامیوں کا اعتراف نہ کرنا ناقد کی کمزوری ہے اور اس میں نہ میری توہین ہے نہ مُصنّف کی۔ میرا مقصود اس چمن سے گلچینی ہے۔ صحنِ چمن کانٹوں سے پاک نہیں ہوتا مگر میں اپنے دامن کو اس سے الجھانا نہیں چاہتا۔"[1]

اسی انداز سے عزیزؔ نے مرزا رسواؔ اور اخترؔ لکھنوی کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ عزیزؔ نے "مرزا صاحب کی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو ایک سو چوالیس (۱۴۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں عزیزؔ نے مرزا کے کلام کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے۔ مثلاً عزیزؔ لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب کے کلام کے خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) کوثر سے دُھلی ہوئی زبان شستہ، صاف، سلیس

(۲) انداز میں بانکپن

(۳) فصحا کے محاورے

(۴) خیالات بلند فلسفیانہ مگر اسی حد تک جہاں تک غزل متحمل ہو سکے۔

(۵) عاشقانہ رنگ غالب مگر ہر تخیل ابتذال سے پاک و صاف"[2]

جعفر علی خاں اخترؔ لکھنوی کے کلام پر عزیزؔ نے جو تبصرہ کیا ہے وہ اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے، تبصرہ کا انداز مندرجہ ذیل ہے:۔

---

[1] "روحِ رواں" صـ۵۹

[2] مرزا رسواؔ کے تنقیدی مراسلات صـ۱۰۷

"... اثر کا کلام حسن و عشق کے جذبات کا آئینہ ہے۔ ابتذال اور سوقیانہ انداز بیان سے پاک و صاف، فلسفہ، اخلاق، تصوف و معرفت کی جھلک بھی اکثر اشعار میں ہے۔ متانت و سنجیدگی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ ..
اثر نے میر کا کلام دقیق نظر سے دیکھا نہ صرف دیکھا بلکہ اس کی پیروی اور تقلید کی بھی کوشش کی اور کہیں کہیں ان کو کامیابی بھی ہوئی"[1]

عزیز نے اپنے معاصرین کے علاوہ متقدمین کے کلام پر بھی تبصرہ کیا ہے کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ مرزا غالب کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"فلسفیانہ، عاشقانہ، درد انگیز، رندانہ، ہر رنگ اُن کے کلام میں حد ترقی تک موجود ہے، رندانہ مذاق نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ وہ علماً اور عملاً دونوں حیثیتوں سے اُس پر قدرت رکھتے تھے، شوخی ظرافت نے اُن کی طباعی اور رندانہ مذاق کر شاعرانہ اثر کو چوگنا کر دیا تھا۔۔ ہر شعر فلسفہ، حسن و عشق کی روح ہے جہاں تک اُس پر غور کیا جاتا ہے لطائف معانی کا ایک دریا موجیں مارتا ہوا چلا آتا ہے۔ اللہ رے اثر۔ اُن ری لذت، تاثیرات اور جذبات اور معنوی نزاکتوں کا بادشاہ تھا۔ بیشتر بہت دن تک ریختہ گوئی مرزا بیدل کے انداز پر کی۔ آخر میں صاف صاف شعر کہے اور میر ہی کے رنگ پر جان دی۔ کلام میں جا بجا فارسی رنگ کا ایسا ڈھب دیا جس کی شوخی نے اہل سخن کو لبھایا.... آج تک میر کے بعد اگر کلمہ پڑھا جاتا ہے تو غالب ہی کا۔ ابھی کیا ہے زمانہ جس قدر ترقی کرتا جائے گا اور علوم کی

---

[1] مقدمہ اثرستان صفحہ ۲

اشاعت ہوتی جائے گی اس کی شاعری کی قدر اتنی ہی ہوتی جائے گی اس کے سخن کا سکۂ رائج الوقت کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا... وہ جزو کا دیوان کیا قلعہ سخن کو ہلا ڈالا ملکِ نظم میں ہلچل ڈال دی۔[1]

غالب کے کلام پر جو رائے قائم کی اُس پر آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھا سکا۔ کلام غالب کی مقبولیت کے لئے جو پیشین گوئی عزیز کر گئے تھے وہ آج سچ ثابت ہو چکی ہے۔ اس سے عزیز کی سخن فہمی کا معیار ظاہر ہوتا ہے اور ان کی اصابتِ رائے اور زورِ نقد و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر تقی میر کے کلام پر بھی اسی طرح جچی تلی تنقید کرتے ہیں۔ مثلاً

"...... ہر شعر میں تاثیر کی روح پھونکی ہوئی ہے۔ یہ شعر زندہ شعر ہے۔ ... سہلِ ممتنع اسی کا نام ہے.... شعر بتلا رہے ہیں کہ یہ جس درد انگیز دل سے نکلے ہیں وہ دل امتحان گاہِ محبت میں زخموں سے چور ہے.....

کہاں ہیں دقیقہ شناس سخن کہاں ہیں اہلِ معانی و بیان دیکھیں اغراض نفسیانیہ کی تصویریں وہم و خیال کی شکلیں واقعات کے فوٹو یوں کھینچتے ہیں۔ بے شک اے میر تو اپنے فن کا حکیم علی الاطلاق ہے۔ لاریب تو ایسا مصور ہے جس کے قلم نے فطرت کی ان صنعتوں کو ظاہر کر دیا۔ جس کو نہ کوئی دیکھ سکتا تھا نہ بتا سکتا تھا۔ تو تعریف سے مستغنی ہے۔

...... تیرے شعر فریضۂ نظم کے بعد وظیفہ ہو گئے ہیں فصاحت نے تیرے کلام کو عوام میں ضرب المثل بنا دیا۔ بلاغت نے تیرے افکار کو خواص میں زبان زد کر دیا۔ رہتی دنیا تک تو رہے گا۔

---

[1] معیار لکھنؤ جنوری ۱۹۰۸ء ص ۱۷

کوئی مٹانے والا تجھے مٹا نہیں سکتا۔ سو برس پیشتر تو نے خود اپنی نسبت پیشین گوئی کی ہے۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

عزیز نے عالم ارواح کے دو مشاعرے لکھے ہیں[۱] ۔ ایک میں میر اور دوسرے میں دلی صدرِ مشاعرہ ہیں، شمع گردش کرتی ہے۔ شعراء اپنا اپنا کلام سناتے ہیں عزیز بھی شریکِ مشاعرہ ہیں۔ ہر شاعر کے کلام پر تھوڑا بہت تبصرہ ضرور کرتے ہیں۔ کلام کے محاسن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ عیوب کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً

داغ کے لئے لکھتے ہیں:۔

"داغ کے کلام کی صفائی قابلِ تعریف ہے لیکن بلاغت کم نزاکتِ معنوی اور رسائی تخیل کا وہ مرتبہ نہیں جس کو میر سا استادِ مسلم الثبوت پسند کرے۔ شعر بہت صاف اور عام فہم یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں بہت مشکل اور خداداد بات ہے۔"

امیر کے لئے لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔ شعروں میں استادی کا رنگ ہے۔ نزاکتِ معنوی بھی ہے۔ گو اُن کا کلام اس رنگ کا کم ہے۔ نوٹ کی طرف طبیعت بہت جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اصلی رنگ وہی ہے۔ مگر اس قسم کے بھی شعر اُن کے دیوان میں دستیاب ہوتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مذاق پر بھی قدرت ہے۔"

اسی طرح ہر شاعر کے کلام پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے تعشق کے لئے لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ کی شاعری میں اسی شخص نے چار چاند لگائے اور یہ دکھا دیا کہ

---

[۱] مشاعرۂ عالمِ ارواح از رسالہ معیار لکھنؤ جنوری ۱۹۱۰ء صفحہ ۱

دیکھو معاملات عشق کی اصلی تصویریں یوں دکھاتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے بھروسے پر لکھنؤ کی شاعری تنہا اہلِ دہلی سے مقابلہ کر سکتی ہے"۔

منیر شکوہ آبادی کے لئے لکھتے ہیں:۔

"بڑی قوت کا شاعر ہے لیکن مقامِ غزل عام پسند نہیں۔ قصیدہ اور مثنوی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ پُرگوئی اور مضمون آفرینی ان کا حصہ ہے نزاکتِ خیال، حسنِ بندش اور تازگیٔ مضامین، خوبیٔ ترجمہ یہ سب باتیں ترقی کے انتہائے مرتبہ پر ہیں۔"

ذوق کے لئے:۔

حقیقت میں ذوق کی زبان بڑی پاکیزہ زبان ہے۔ عام فہم۔ بنوٹ ہے محاورات خوب نظم کرتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں غزلیں زیادہ ہیں۔ تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں، مزہ کسی قدر کم ہے تعقیدِ لفظی کو شعت سمجھتے ہیں۔ آزاد نے آبِ حیات جیسا تذکرہ لکھا۔ ذوق کے حالات میں انھوں نے جادۂ اعتدال سے بڑھ کر قدم رکھا اور ان کے تمام معاصرین خاص کر غالب سے ترجیح بلا مرجح دی۔ آخر مورِدِ طعن ہوئے۔

آتش کے لیے:۔

بنوٹ کہی تو اس میں مزہ اور اثر بھرا صاف کہا تو ایسا ہما کہا"

ناسخ کے لیے:۔

طرزِ جدید کا موجد اور قدیم روشوں کا ناسخ۔ اصلاحِ زبان

کا سہرا انھیں کے سر رہا اور لکھنؤ کی شاعری کا چراغ سب سے پہلے
انھیں کے متبرک ہاتھوں سے روشن ہوتا ہے۔"

اسی طرح مومن کی نازک خیالیوں علاوہ مضامین اور لفظوں کی تراش
خراش کی تعریف کرتے ہیں۔ غالب سے ملتا ہوا رنگ، جا بجا فارسی کی لطیف
چشمک، اور عاشقانہ معاملات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دینے کو سراہا ہے۔ اکثر
شعروں میں ایہام ضرور ہوتا ہے جو ان کی طبیعت کا خاص جوہر ہے۔ مصحفی کے
شعر میر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ مصحفی بھی بڑا سحر البیان شاعر
تھا۔ اُن کے چھ دیوان ہیں۔ زود گوئی اور خوش گوئی ان کا حصہ تھی۔ لکھنؤ میں
سیکڑوں کو شاعر بنا دیا۔ ہر رنگ پر قدرت تھی۔ ہر صنف میں مشاق۔ آزاد
نے کسی قدر ان کی نسبت خلافِ انصاف رائے قائم کی ہے کہ اپنے ہم عصروں
کی طرح طبیعت میں چابلاسٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی۔ ناظرین
فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس قیامت کا درد اس شخص کے کلام میں تھا اور کیسی کیسی
شوخیاں ہیں۔ اگر ان کے دواوین چھانٹے جائیں تو بہت حصہ ایسے شعروں کا
نکلے گا۔"

عزیز شعراء کے کلام پر رائے قائم کرتے وقت صداقت اور انصاف
کی نظر رکھتے ہیں۔ وہ محمد حسین آزاد کے علم و فضل سے مرعوب نہیں ہوتے
ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ انھوں نے آبِ حیات میں ذوق اور
مصحفی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

عالم ارواح کے پہلے مشاعرے میں میر، غالب، داغ، امیر، تعشق،
منیر، ذوق، آتش، ناسخ، مومن اور مصحفی کے کلام پر اپنی رائے ظاہر
کرنے کے بعد دوسرے مشاعرے میں زردہ، نسیم، آشفتہ، شہیدی، موذوق

لہ معیار، لکھنؤ جنوری ۱۹۰۹ء ص ۹

جرأت، انشاء، درد، سودا اور ولی کے کلام پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔

تشریحی تنقید:۔ عزیز نے شعراء کے کلام پر صرف تبصرہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اُن کے اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔ شعر کے لفظی و معنوی محاسن پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ کہیں کہیں معائب کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کیا ہے "اثر ستان"، اور "روح رواں" میں تشریحی تنقید کے بے شمار نمونے پیش کئے ہیں "تجلیات" میں بھی مفتیٔ میر محمد عباس صاحب کے شعر پر کہیں کہیں تشریحی تنقید کیا ہے تشریحی تنقید کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

غالب کے ایک شعر پر عزیز تنقید کرتے ہیں :-

شعرِ غالب:- حیراں ہوں شوخیٔ رگِ یاقوت دیکھ کر + ہاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برابر ہے

تنقیدِ عزیز:- صحبت برابر ہونا یعنی موافق ہونا۔ یاقوت سے تشبیہ آتش کی اور رگِ یاقوت وہ خطوط جو یاقوت میں ہوتے ہیں۔ اس کی خس سے تشبیہ دی ہے خس و آتش کا ایک جگہ ہونا محال ہے مگر شوخیٔ رگِ یاقوت نے اس کلیہ کو باطل کر دیا ہے۔ بظاہر اس مضمون کو غزل سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اگر یاقوت سے مراد لبِ معشوق اور رگ سے مراد تحریرِ پان لیں تو زیادہ لطافت ہو جائے گی اور حدودِ غزل میں آجائے گا۔ "ہاں ہے" "ہاں ایں جاست" کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو میں یہ فصیح نہیں معلوم ہوتا۔ مرزا نے اپنے اردو کلام میں اس قسم کے فارسی تصرفات بہت کئے ہیں اور اس کے وہ موجد ہوئے ہیں۔ بیشتر اُن میں قابلِ تقلید ہیں اور بعض اُنھیں کی ذات تک محدود ہیں[1]"

---

[1] معیار مئی ۱۹۰۰ء ص ۱۱

عزیز کبھی شعر پر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں اور بڑی صراحت کے ساتھ اس کی تنقید کرتے ہیں۔ کبھی شعر کو اجمالی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی خصوصیات کی طرف اشارے کرتے ہیں "اثرستان" کے مقدمہ میں اثر لکھنوی کے اشعار پر علمی تنقید کے نمونے پیش کئے ہیں۔ کہیں اشارے کرتے ہوئے سرسری گذر گئے ہیں اور کہیں جم کر شعر کی تشریح اس انداز سے کی کہ اپنی دیدہ وری کا ثبوت دے دیا کہیں کہیں تقابلی تنقید کی مثال بھی پیش کی ہے۔ مثلاً اثر کا شعر ہے ؎

شعر اثر:- رات کو ہوک دل میں ایسی اٹھی اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا

اس شعر پر عزیز تنقید کرتے ہیں اور انشاء کے شعر سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

تنقید عزیز:- ہوک اٹھنے سے دل کا ننھا ہو جانا اور بجائے دل صرف ایک گرہ رہ جانا لطیف اور غیر معمولی بات ہے۔ ہوک سے گرہ پڑنا تو نئی بات نہیں ہے۔ سید انشاء اللہ خاں انشا نے بھی اسی مضمون کو کہا ہے ؎

گرہ حسرت کی ہر تارِ نفس میں پڑ گئی جس سے یہ کیسی ہوک ہر دم اے دلِ پر درد اٹھتی ہے

مگر انشا نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اثر نے دل ہی کو گرہ بنایا یعنی دردِ عشق سے دل ایک عقدۂ لاینحل ہو کر رہ گیا۔[1]

صرف اردو اشعار ہی سے نہیں بلکہ فارسی شعراء کے کلام سے بھی مقابلہ کرتے ہیں جو "اثرستان" میں موجود ہے۔ عزیز کی تنقید کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ شعر کے معائبِ اس طرح بیان کئے جائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تنقید کا فرض بھی ادا ہو جائے اور شاعر کو اذیت بھی نہ ہو۔ مثلاً

---

[1] مقدمہ اثرستان صفحہ ۲۰

شعرِ اثر:۔ روگ ہیں جان کو دنیا بھر کے ہم تو پچھتائے محبت کر کے

تنقیدِ عزیز:۔ گو عشق کا مذاقِ بلند اس کا متحمل نہیں کہ محبت کے بعد اظہارِ ندامت ہو۔ مگر ہجومِ مصائب سے انسان کبھی اکتا ہی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عشق کی جانکاہیوں کی عظمت بھی اس سے ثابت ہوتی ہے۔ اثر غزل بہ رنگِ دہلی کے اتباع کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر کبھی حب وطن لکھنؤ کے رنگ پر بھی کھینچ لاتا ہے لیکن اس رنگ میں بھی انداز دلکش ہوتا ہے[1]

عزیز لایعنی مبالغہ کے قائل نہیں۔ اثر کے ایک شعر میں مبالغہ بطور صنعت استعمال کیا گیا۔ عزیز نے اس پر خوشگوار اعتراض کیا۔ وہ کہتے ہیں:۔

"مبالغہ تخیل کے حسن کو برباد کر دیتا ہے۔۔۔ اثر کے شعر میں مبالغہ تو ضرور ہے مگر ادا اس اسلوب سے ہوا ہے کہ بظاہر امکانی صورت نظر آتی ہے"[2]

کلامِ اثر کے جملہ خصوصیات جو عزیز نے بے نقاب کئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

"اشعار میں تاثر ہے۔۔۔ عظمتِ انسانی کی تصویریں ہیں۔۔۔ محویت کا واضح اظہار ہے۔۔۔ کہیں عظمتِ عشق ہے۔ کہیں اگر فرسودہ مضمون ہے مگر اندازِ بیان سے اسے دنیا کر دیا ہے۔ کہیں تخیل کی بلندی حقیقت کے دوش بدوش ہے۔ کہیں نوشتۂ تقدیر کو نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ کہیں تصوف کی کارفرمائی ہے۔ کہیں مدت اسیری کا درد

---

[1] مقدمہ اثرستان ص۲۲

[2] مقدمہ اثرستان ص۲۳، ۲۴

انگیز بیان ہے۔ کہیں فلسفۂ حیات و ممات کو سہل ممتنع طریقہ پر ادا کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں شعر میں مذہبی پہلو بھی موجود ہے[1]۔"

اس طرح عزیز نے کلام اثر کا جائزہ لیا ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ عزیز نے کلام کو ہر رُخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلام کے جمالیاتی تاثراتی نفسیاتی، اخلاقی، فلسفیانہ اور صوفیانہ پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے اس پر اپنی رائے قائم کی ہے مگر کلام کے معائب اور محاسن پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہے

اثر کے علاوہ رواں کے کلام پر بھی عملی تنقید کی ہے یہ تنقید بیالیس صفحات پر مشتمل ہے اور نظم، غزل، قطعہ اور رباعی کا احاطہ کیا گیا ہے اس میں عزیز نے جس جگر کاوی، دیدہ ریزی اور پُرکاری سے کام لیا ہے وہ مستحق تحسین ہے۔ بطور نمونہ رواں کی صرف ایک رباعی پر عزیز کی عملی تنقید پیش ہے۔ رواں کی رباعی:-

دل تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو شاید یہ قلم ہی نخل بار آور ہو
مقراضِ اجل ہے قاطعِ شاخِ حیات ممکن ہے اسی میں رازِ جاں مضمر ہو

تنقیدِ عزیز:- جسے ہم اجل سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ حقیقی حیات وہی ہو۔ لہٰذا موت سے ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ اندازِ بیان کی خوبی ظاہر ہے۔ کل حیات ایک نخل ہے اور ہر متنفس کی زندگی ایک شاخ ہے۔ بعض کو قطع کر کے باغبانِ اجل نئی قلمیں لگاتا ہے۔ اس طرح اور درختوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے جن میں اصلی قلم کی خصوصیتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ زندگی کا مفہوم اس سے وسیع ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے

---

[1] مقدمہ اثرستان صفحہ ۲ سے صفحہ ۲۸

ہم دوسروں میں یقیناً زندہ رہ سکتے ہیں۔ ایسے نقوش ایسی یادگاریں جن میں ہماری حیات کا پر تو ہے دوسروں کو ودیعت کر سکتے ہیں۔"[۱]

عزیزؔ کے تنقیدی نمونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں قوت انتقاد تھی اور وہ اچھی خاصی تنقیدی صلاحیت کے حامل تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کو عدیم الفرصتی مرض اور موت نے اتنی اجازت نہیں دی کہ فن تنقید پر کوئی مستقل کتاب تصنیف کر جاتے۔ بایں ہمہ "مرزا رسوا کی شاعری"، "دیباچۂ نشاط سخن"، "مقدمۂ اشرستان"، "مقدمۂ روح رواں"، "تجلیات" اور وہ تنقیدی مضامین جو زمانہ کانپور، الناظر لکھنؤ، اور معیار لکھنؤ کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، عزیزؔ کی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

عزیزؔ نے آرٹ اور ادب کے متعلق کوئی ایسا تصور نہیں پیش کیا جس کے وہ خالق کہے جا سکیں۔ مگر انھوں نے ادبی تصورات کے پرانے اور نئے ذخیروں سے ایسے کار آمد تصورات منتخب کر کے پیش کیے جن کا عصرِ حاضر متقاضی تھا۔ انھوں نے کوئی نیا تصور پیش کرنے کی جگہ رائج الوقت قدیم اور جدید نظریات کو اپنے رد و قبول کے ذریعہ اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ اس طرح انھوں نے تنقید کا ایک معیار قائم کر کے ادبی خدمت انجام دی۔ لہٰذا عزیزؔ مستحق ہیں کہ حالیؔ، شبلیؔ، اور آزادؔ کے بعد مصلحینِ ادب اور ناقدینِ فن کی فہرست میں ان کا بھی نام درج ہو۔

• مجموعی تجزیہ۔ گذشتہ ابواب کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عزیزؔ ایک بلند پایہ

---

[۱] مقدمۂ روح رواں ص۸

شاعر، ایک صاحب طرز نثر نگار، ایک محتاط مورخ، ایک منصف مزاج ناقد، ایک معیاری مدیر اور ایک قابل مولف لغت تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور قابل قدر عطیہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک نباض وقت کی طرح عصری تقاضوں کو ذہن میں مد رکھتے ہوئے، گل و بلبل اور زلف و شانہ میں پھنسی ہوئی لکھنوی غزل کو آزاد کیا۔ اخلاقی اور عارفانہ مضامین داخل کرکے دامن غزل کو وسعت دی تکلف، تصنع اور خارجی محاسن کے بیانات سے پرہیز کیا۔ ماضی کے گلزاروں کی سیر اور قدما کی تقلید سے اپنے کلام میں استادانہ رنگ پیدا کیا پھر اس میں نئے ادبی رجحانات داخل کئے اور تغزل میں جان ڈال دی۔ لکھنو کی غزل گوئی کو ایک نئی سمیت اور ایک نیا لب و لہجہ دینے میں اس وقت کے گرانقدر مصلحین ادب میں عزیز کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔

عزیز کے کلام میں واردات قلب کی سچی تصویریں، جذبات نگاری، روحانیت سوز و اثر، زبان کی شیرینی، الفاظ کی دلکش ترتیب، محاورات کی دلاویزی، فصاحت و بلاغت اور سلاست و روزمرہ کی تمام لطافتیں موجود ہیں۔ انھوں نے فلسفہ کے دقیق مسائل غزل کے دلسوز نغموں میں پیش کئے، اخلاقی مضامین کو حسن و عشق کے رنگین سانچوں میں ڈھال کر فن کو نئی جلا بخشی۔ عزیز نے اپنی غزلوں کے تاج محل کی بنیاد علم کی مضبوط چٹان پر رکھی ہے جسکے منہدم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں اور ایسے سرچشموں سے شاعری کا مواد حاصل کیا ہے جن کے خشک ہونے کا اندیشہ نہیں۔

عزیز نے روایتی غزل سے مصالحت کرتے ہوئے اُسے جدید راستہ پر لگایا۔ عزیز کے دو دواوین لکھنؤ کے جدید تغزل کے بہترین مرقعے ہیں۔ بلا مبالغہ عزیز دبستانِ اردو میں ایک قد آور اور متنوع شخصیت کے حامل تھے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ نیاید	نسیمے از حجاز آید کہ نیاید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے	دگر دانائے راز آید کہ نیاید

برسات کا ایک منظر

عزیز کے سلسلہ میں تلاش و جستجو کے دوران اُن کا غیر مطبوعہ کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔ اس ذخیرے میں قابلِ قدر نظمیں بھی شامل ہیں کچھ نظمیں ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں جو اس مقالہ کی اہمیت اور افادیت میں بہرحال اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔"

موسمِ گُل ہے چمن ہے اور بھری برسات ہے
تختۂ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
جلوہ گر ہر ایک ذرہ سے خدا کی ذات ہے
چشمِ دل محوِ جمالِ حسنِ مصنوعات ہے
پھول کا ہر صفحہ کیا ہے وادیٔ تجرید ہے
غنچۂ سربستہ میں اک عالمِ توحید ہے

سبزہ لہریں لے رہا ہے نکہتِ گُل بیقرار
ہر طرف ہے جلوہ گر حدِ نظر تک لالہ زار
کوہساروں میں بھرے ہیں نغمہائے آبشار
تازہ پھولوں سے ہے مملو دامنِ فصلِ بہار
گُل کھلا ہے جو وہ بلبل کا دلِ صد پارہ ہے
الغرض دنیا تمام ایک جنتِ نظارہ ہے

یہ سماں فرحت فزا اور تیرا جھولا جھولنا
یہ پپیہوں کی صدا اور تیرا جھولا جھولنا
یہ بہار دلربا اور تیرا جھولا جھولنا
اُف یہ جنگل کی ہوا اور تیرا جھولا جھولنا
پینگ جب تو نے لیا دل ہاتھ سے جانے لگا
حسن کے دریا میں جزر و مد نظر آنے لگا

سر سے پا تک اک ادائے دلربا چھائی ہوئی
آنکھ شرمائی ہوئی اور زلف لہرائی ہوئی
پینگ لینے میں ہزاروں رُخ سے بل کھائی ہوئی
شانۂ بادِ صبا سے خوب سلجھائی ہوئی
کیوں نہ ہوائے کاکل مرغولہ اوج ہوا
منصبِ مشاطہ پائے جبکہ ہر موج ہوا

عشق کا کھوئے ہوئے دفتر نگاہِ شرمگیں دوش پر بکھری ہوئی مرغولۂ زلفِ عنبریں
رستخیز انداز ہے ہر اک ادائے دلنشیں کون ہے اے حسن کی دیوی ترا نقش آفریں
گود میں ناز و ادا کی کس نے پالا ہے تجھے
حسن کے سانچے میں بتلا کس نے ڈھالا ہے تجھے

ناگنیں لہرا رہی ہیں اے نگارِ مہ جبیں باندھ لے جوڑا غضب ڈھاتی ہے زلفِ عنبریں
ہو چلی ہے تیرگی پیدا ہوا میں یا نہیں خوف ہے مجھ کو سیہ آندھی نہ آجائے کہیں
تار جو گیسو کھلا ہے گویا رہِ ظلمات ہے
خیر ہو دل کی الٰہی یہ اندھیری رات ہے

وہ ترا جوشِ طرب زیرِ درختِ سایہ دار وہ جوانی کی امنگیں رنگِ رخ کا وہ نکھار
ہے سیہ پتلی میں جادو انکھڑیوں میں ہے خمار ابروئے پیوستہ سے شکلِ ہلالی آشکار
ہے لبوں پر مسکراہٹ بھی وفورِ ذوق میں
خاص ادا سے ڈوریاں جھولے کی دستِ شوق میں

چپ ہے تو کرتی ہیں لیکن تیری آنکھیں گفتگو ہے تری چتون سے پیدا میری شرحِ آرزو
دیدنی ہے پینگ لینے میں ترا جوشِ نمو دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں جوانی کا لہو
حسن پر خود اپنے دلدادہ ہیں دھانی چوڑیاں
زہر کھلوانے پہ آمادہ ہیں دھانی چوڑیاں

سر سے پا تک دلکش اک تصویرِ جذباتِ شباب جلوہ ہے یا رخ میں گردش کر رہا ہے آفتاب
صندلی ماتھے کا ٹیکہ ہے وہ نقطۂ انتخاب حسن کے دفتر میں مل سکتا نہیں جس کا جواب
سامنے یہ منظرِ عشرت فروزاں رات ہو
تو ہو اور گلشن ہو اور مینہ برسات ہو

میر تقی میر

شاہدِ بزمِ سخن ناطورۂ معنی طراز
اے خدائے ریختہ پیغمبرِ سوز و گداز

یوسفِ ملکِ معانی پیرِ کنعانِ سخن
ہے تری ہر بیت اہلِ درد کو بیت الحزن

اے شہیدِ جلوۂ معنی فقیرِ بے نیاز
اس طرح کس نے کہی ہے داستانِ سوز و ساز

ہے ادب اردو کا نازاں جس پہ ہے وہ تیری ذات
سرزمینِ شعر پر اے چشمۂ آبِ حیات

نغمہ دل آشفتہ سر آتش نوائے خویشتن
آہ تیری سینہ سوز اور نالہ تیرا دل شکن

ختم تجھ پر ہو گیا لطفِ بیانِ عاشقی
مرحبا اے واقفِ رازِ نہانِ عاشقی

سرزمینِ شعر کعبہ اور تو اس کا خلیل
شاخِ طوبائے سخن پر ہے تو اے جبرئیل

جوشِ استغنا ترا تیرے لیے وجہِ نشاط
شانِ خودداری تری آئینہ دارِ احتیاط

بزم سے گذرا کمالِ فقر دکھلاتا ہوا
تاجِ شاہی پائے استغنا سے ٹھکراتا ہوا

تھا دماغ و دل میں صہبائے قناعت کا سرور
تھی جوابِ سطوتِ شاہی تری طبعِ غیور

موجۂ بحرِ قناعت تیری ابرو کی شکن
تختِ شاہی پہ حصیرِ فقر تیرا خندہ زن

تھا بہ جوہر تیرا فطری شاعری کے رتبہ داں
عزتِ فن تھی تری نازک مزاجی میں نہاں

ملتفت کرتا تجھے کیا اغنیا کا کر و فر
تھا تری رگ رگ میں درویشوں کی صحبت کا اثر

دل ترا زخموں سے بزمِ عاشقی میں چور ہے
جس سخن کو دیکھئے رِستا ہوا ناسور ہے

بزم گاہِ حسن میں اک پرتوِ فیضِ جمال
صید گاہِ عشق میں ہے ایک صیدِ خستہ حال

دیکھنا ہو گر تجھے دیکھے ترے افکار میں
ہے تری تصویر تیرے خونچکاں اشعار میں

آسمانِ شعر پر چمکے ہیں سیارے بہت
اپنی اپنی روشنی دکھلا گئے تارے بہت

عہدِ گل ہے اور وہی رنگینیٔ گلزار ہے
خاک ہند اب تک اگر دیکھو تجلی زار ہے

اور بھی ہیں معرکہ میں شہسوارِ یکہ تاز
اور بھی ہیں میکدے میں ساقیانِ دلنواز

ہیں تو پیمانے وہی لیکن وہ مے ملتی نہیں
نغمہ سنجوں میں کسی سے تیری لے ملتی نہیں

صاحبانِ شوق کے سینوں میں تھی جس کی کھٹک
پیرتے ہیں دل میں وہ سر تیز نشتر آج تک

کاروانِ رفتہ کو تھا تیری یکتائی پہ ناز
عصرِ موجودہ نے بھی مانا ہے تیرا امتیاز

ہو گئے ہیں آج تجھ کو ایک سو بالیس سال
تو نہیں زندہ ہے دنیا میں مگر تیرا کمال

حق ہے ہم پر یاد کر کے تجھ کو رونا چاہیے
ماتم اپنی ناشناسی کا بھی ہونا چاہیے

ڈھونڈھتے ہیں قبر کا بھی اب نشاں ملتا نہیں
اے زمیں تجھ میں ہمارا آسماں ملتا نہیں
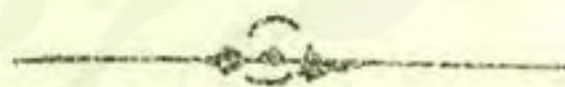
صبحِ پیری

کٹی شامِ جوانی ہے زمانہ صبحِ پیری کا
بس اب اٹھ سونے والے ہو گیا ہے نور کا تڑکا

کہاں تک سوئے گا کیوں لے رہا ہے نیند کے جھونکے
ابھی تو کنجِ مرقد میں تجھے تا حشر ہے سونا

انتق سے سر کے کافورِ سحر کی نکہت آئی ہے
مہیا کر لے سامانِ حنوط و توشۂ عقبےٰ

ذرا کھول اب تو آنکھیں باندھ سامانِ سفر غافل
جرس بجنے ہی کو ہے قافلہ تیار ہے سارا

یہ کیا غفلت ہے منہ دھو اٹھ کے اب اشکِ ندامت سے
صدا دیتا ہے میرِ کارواں لے ہوش میں آجا

ترے کردار پہ ہے خندۂ صبحِ کفن غافل
ترے انجام پر ہے گریۂ شمعِ لحد گویا

بصارت کم ہوئی کب دیدۂ بے نور کی تیرے
ستارے صبح کے اب جھلملاتے ہیں وہ وقت آیا

قدِ خم گشتہ کہتا ہے کہ اب تو جھک اطاعت میں
گئے دن سرکشی کے دعوئ نخوت ہے نازیبا

فروغ اب دے نشانِ سجدہ کو پیری میں اے غافل
سحر ہوتے ہی پیشانی پہ چمکے صبح کا تارا

نہ کرنا عہدِ پیری میں بھروسا دم کا اک ساعت
فنا کر دے گا اک دن یہ نسیمِ صبح کا جھونکا

دمِ لغزش خبر دی رعشۂ اندام نے غافل
لبِ بام آ گیا ہے آفتابِ زندگی تیرا

چھپائے گا بیاضِ صبح کب تک پردۂ شب میں
محاسن میں لگائے گا خضاب اب تا بہ کے پتلا

شکن اعضا میں آئی دور کر جمعیتِ خاطر
پریشاں ہو چلے تیرے کتابِ عمر کے اجزا

فنا کا وقت آیا جنبشِ سر خود موید ہے
کیا قد دوتا نے تیری ہستی کو بشکل لا

حدوثِ عالمِ امکاں کا مثبت خود تغیر ہے
نظر کر اپنی حالت پر کہ کیا تھا تو ہوا اب کیا

یہ خطِ نسخ فردِ زندگی پر تیرے کھنچتے تھے
جسے پیری میں اپنے جسم پر تو جھریاں سمجھا

یہ صیقل کی ہے پیری نے کہ تو دیکھ اپنی ہستی کو
نہیں یہ جھریاں ہیں جو ہر آئینۂ اعضا

وجودِ نیستی کا وہم اے مغرور بے جا ہے
انانیت کا مرجع نفسِ انساں ہو نہیں سکتا

کہا یہ جھریوں نے زندگی کی منزلیں طے کیں
زہے ہمت رہا اس کام کا پیری کے سر سہرا

خیالِ زندگانی دل میں کیوں ہر وقت رکھتا ہے
حقیقت دیکھ تو اپنی کہ تو ہے خاک کا پتلا

کہاں وہ بزم آرائی دخورِ شوق کی غافل
کہاں وہ ساز و ساماں جب طلسمِ زندگی ٹوٹا

اسے آبِ بقا سے پہلے دھوئے مطمئن پیر ہو
لگا ہے دامنِ دنیا پہ داغ اک بے ثباتی کا

اگر ہے عاقبت اندیش دیکھ آئینۂ عبرت
کہ جس میں عکس ہستی ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا

لباسِ ماتمی پہنے ہوئے شامِ جوانی ہے
سپیدی کفن دکھلا رہی ہے رنگ پیری کا

مثالِ نیستی خود ہے ترے جسمِ مثالی میں
فنائے جسم ثابت کر رہے ہیں خود ترے اعضا

سکھا دے ہئیت فطرت تجھے رفتارِ معدومی
بنائے اس سے پرکارِ قدم تیرے بشکلِ لا

حیاتِ جاودانی کی اگر خواہش ہے اے غافل
اجل آنے سے پہلے چاہیئے تجھ کو فنا ہونا

خدا کو ڈھونڈھتا ہے گر چہ ترکِ ماسوا اللہ کر
متیٰ ما تلق من تھوی دع الدنیا واھملہا

نہیں نزاکت ہے مشتِ خاک سے تیرا تنِ نازک
تجھے لازم ہے قلبِ ماہیئت کی بھی خبر رکھنا

ہوئی ہے استطاعت تجھ میں اب پیری کے آنے سے
ارے اے بے خبر واجب ہے حجِ آخرت کرنا

مناسک کو ادا کر باندھ احرامِ کفن غافل
صدا لبیک کی دے اب حضورِ دوست پہ جانا

منائے دل میں گر اب خواہشِ دنیا کی قربانی
قدم سے سعی کر سوئے صفا و مروۂ عقبےٰ

یہ لازم ہے کہ نذرِ نقدِ جاں اک حج میں دے پہلے
تمتع کی جو خواہش ہے تجھے اے بندۂ دنیا

اگر خواہش بھی ہو مقبول حج کر ترکِ آرائش
نہ دیکھ آئینہ تک مغرورِ خود بینی نہیں زیبا

کلاہِ کج نہ رکھ مغرور کچھ تجھ کو خبر بھی ہے
یہ تیرا کاسۂ سر طعمۂ کرمِ لحد ہوگا

یہ مانا ہم نے تو ہے بادشاہِ ہفت کشور بھی
حضورِ دوست کیا کام آئے گا تیرا یہ استغنا

نظامِ عالمِ امکاں سپردِ موت ہے غافل
نہ کر نظم و نسق میں مملکت کی کوششِ بیجا

ترے قبضے میں مانا ممکنت ہے ربع مسکوں کی
متاعِ آخرت کیا کی مہیا تو نے یہ بتلا

خیالِ تنگیٔ کنجِ لحد کچھ چاہیئے تجھ کو
یہ قصرِ دل کشا بنوا کے کیا آرام پائے گا

لباسِ قاقم و خز کیا سمجھ کے تو نے پہنا ہے
کیا ہے کس لئے زیبِ بدن یہ خلعتِ زیبا

معطر کر رہا ہے رخت ہستی کس لئے غافل
وہ کبھی دن یاد رکھ جب جیفۂ ناپاک تو ہوگا

کرے گا اتفاقاً مس جو کوئی تیرے پیکر کو
بحکمِ شرع واجب ہوگا اُس کو غسل بھی کرنا

پہن لے کسوتِ الفقرِ و فخری جسمِ خاکی پر
ارے او محوِ آرائش یہی ہے زینتِ تقویٰ

بھلا دے سرگذشتِ عہدِ طفلی و جوانی کو
صدائے الرحیل اب آ گئی ہے ہوش میں آ جا

نہ جان اِس کو ذریعہ امتدادِ زندگی کا تو
پیامِ موت ہر دم دے رہا ہے ہر نفس تیرا

انیسِ شامِ تربت ہوں گے تیرے ایک دن افعی
سرِ آشفتہ سے اب دور کر دے زلف کا سودا

اندھیرا پاکھ ہے پھر چاندنی ہے چار ہی دن کی
عبث نازِ جوانی ہے تجھے یہ حسن پر غزا

ارے او شوکتِ عہدِ جوانی دیکھنے والے
رہے گا محوِ زینت تا بکے اب رکھ دے آئینا

سواد شب سے لکھا عمر بھر غمنامۂ ہجراں
سیاہہ اپنے اعمالوں کا بھی تو نے کبھی دیکھا
نہیں پائے گا کیا تو کیفر کردار اے غافل
گنہ کرتا ہے یوں تو مطمئن ہو کر جو بے پروا

گزاری رات ساری کروٹیں لے لے کے فرقت میں
مگر تکلیف سمجھا تو نماز شب ادا کرنا
رٹا تو فصل گل میں قصۂ پارینۂ بلبل
نہ سمجھا چند روزہ ہے بہار گلشن دنیا

ہوا وقت ولادت گریۂ اطفال سے ظاہر
سکھایا ہے تجھے فطرت نے آتے ہی یہاں رونا
جفا بردار دلبر کچھ تجھے خوف خدا بھی ہے
کسی صورت طواف بتکدہ سے دل نہیں بھرتا

کہاں تک دل میں ہوگا شور اب ناقوس نالہ سے
صنم خانہ کہاں تک خانۂ کعبہ کو سمجھے گا
کہاں تک واعظ و ناصح سے یہ ہرزہ ستیزی اب
کرے گا ورد کب تک تو حدیث عاشقی بتلا

سن اے غافل یہ سب نقش و نگار بے ثباتی ہیں
نہ ہو اس شوق سے تو محو لعبت خانۂ دنیا
اگر خواہان تصدیق خیال بے ثباتی ہو
عزیز اٹھو ذرا دیکھ آئیں گورستان عبرت زا

قطعہ

دیکھنے والے طلسم گردشِ افلاک کے
دل سے قائل ہیں قصور قوتِ ادراک کے
یہ طلسم دہر کیا اور ساکنانِ دہر کیا
اک کرہ ہے گھومتے ہیں جس میں ذرے خاک کے

مرثیۂ علامہ بلگرامی

کیسی خوش قسمت ہے تو گورِ غریباں کی زمیں
عالم ہستی کو تجھ سے رشک کچھ بے جا نہیں
جو گھٹے میں تیرے جو تصویر ہے نایاب ہے
ہے مربع میں ترے جو نقش وہ ہے دل نشیں
دامنِ ہستی سے تو نے چن لئے خوش رنگ پھول
در خور محفل ترے بس اک نہیں ہیں تو ہمیں
یہ طلسمی تیرا شیرازہ کھلے گا ایک دن
اے زمیں ہر ذرہ تیرا ہو گا صورت آفریں
سچ بتا دیکھے تو ہیں تو نے شکستہ مقبرے
کیا نظر آیا ہے تجھ کو اے نگاہِ دور بیں

ہڈیوں کے جا بجا ڈھانچے نظر آئے ہیں جب
کیا اثر تو نے لیا ہے اے دلِ اندوہ گیں

باعثِ جمعیت خاطر تھیں جتنی صورتیں
اک زمانہ ہو گیا ہے وہ کہیں ہیں ہم کہیں

چاند سا مکھڑا کہاں وہ قبر کا ظلمت کدہ
ڈھیر مٹی کا کہاں مرغولہ زلف عنبریں

تھا یہی آئینہ خانہ تیرا اے حسن صبیح
تھی یہی زینت کی جا کیا اے عذار آتشیں

تھی یہی تیری نقاب اے عارضِ گیتی فروز
تھی یہی چھپنے کی جا کیا اے نگاہِ شرمگیں

اے دماغ عرش پیما تیرا مسکن تھا یہی
تھی یہی خلوت تری کیا اے دلِ عزلت گزیں

تھا یہی مرجع تمہارا اے حکیمانِ کہن
تھا یہی حسن المآب اے عالمانِ بالیقیں

تھی یہی کیا خاک کی بستی تمہارا مدرسہ
کچھ بتاؤ اے علوم اولین و آخریں

اس خرابے میں کہو کیوں کر بسر کرتے ہو تم
کون ہیں اصحاب صحبت کون ہیں اب ہم نشیں

کیا ہوئی وہ فلسفہ دانی تمہاری کیا ہوئی
ذوق تحقیق علل میں اب وہ عالم کیوں نہیں

ہیں کتب خانے نہ تصنیفات کے وہ مشغلے
ہے نہ تحقیقِ جدید اب اور نہ وہ رائے رزیں

تم نے ثابت کی تھی ہر ذرے میں اک روحِ رواں
تم نے دکھلا دی تھی ہر منکر کو رفتارِ زمیں

اب انھیں ذرات میں پیکر تمھارا مل گیا
اب اسی رفتار کا پامال ہے جسمِ حزیں

طبقۂ گورِ غریباں کے ہر اک ذرہ کو دیکھ
ناز کر اجرام پر اپنے نہ اے چرخ بریں

تو ہی کچھ انصاف کر اے گردشِ لیل و نہار
تھی یہی کیا ان کی منزل جس میں اب ہیں یہ مکیں

یہ نہ تھی تیری جگہ علامہ سید علی
تھا ترے شایان شان قصرِ سپہر ہفتمیں

اے گروہِ اہل اسلام اے دیارِ بلگرام
ہے ترا سرمایۂ ناز آہ اب زیرِ زمیں

مجلسِ علمی ہیں خالی ہو گئی تیری جگہ
کون ہے اس منزلت کا جو ہو تیرا جانشیں

تیرے علمی کارنامے صفحۂ دنیا پہ ہیں
تو مگر کس گوشۂ خلوت میں ہے عزلت گزیں

تیرا ماتم ہر زباں پر تیرا غم ہر بزم میں
تو مگر ہے محوِ سیر گلشنِ خلدِ بریں

کچھ عدم کے ملک کا طرز تمدن بھی لکھا
کچھ بتا رہتے ہیں کیوں کر اُس خرابے کے مکیں

انتقال ہیکر خاکی ہے صرف اک انقلاب
مرنے والے زندۂ جاوید ہے تو بالیقیں

اپنی تصنیفات کے صفحوں میں تو ہے جلوہ گر
دیکھنے والے تجھے دیکھیں گے تا روز پسیں

چاہیئے ایسی ترقی مرحبا صد مرحبا
یوں رہے زندہ جہاں میں آفریں صد آفریں

مرنے والے تو نے اس دنیا سے منہ موڑا ہے جب
دفتر عبرت تھی تیری وہ نگاہِ واپسیں

منزلِ عقبیٰ کے ساکن وقت وہ بھی ہے قریب
ملنے والے تجھ سے اک دن آکے مل لیں گے وہیں

اے زمانہ سلکِ اہل علم میں جو فرد تھا
کھو گیا ہاتھوں سے تیرے آج وہ درِ ثمیں

چشم دریا بار بتلا یہ تلاطم تا بکے
جوشِ گریہ سے کفِ سیلاب ہے اب آستیں

ملک کی بیدار مغزی سے یقیں تو ہے عزیزؔ
یادگار اُس کی کرے قائم یہ قوم دل حزیں

مآخذ

۱۔ تصانیفِ عزیز

۱۔ افسانۂ عبرت (کتابچہ۔ نظم برائے ایتام) نامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۲۶ء

۲۔ انجم کدہ (دیوان) سرفراز پریس لکھنؤ۔ ۱۹۵۵ء

۳۔ برقِ تجلی (قصیدہ ایک کتابچہ کی شکل میں) مطبع گلشنِ فیض لکھنؤ، سنِ اشاعت ندارد

۴۔ تجلیات (مفتی میر عباس کی سوانح حیات) نظامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۲۵ء

۵۔ تذکرۂ خانوادہ علامہ محمد قلی غیر مطبوعہ مخزونہ کتب خانہ ناصریہ شاستری نگر لکھنؤ

۶۔ سبدِ گل (منظومات و قطعاتِ تاریخیہ) غیر مطبوعہ مخزونہ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ

۷۔ شہیدِ ثالث (سوانح حیات) نامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۲۵ء

۸۔ شہیدِ رابع (سوانح حیات) تجلی پریس دہلی۔ ۱۹۲۹ء

۹۔ صحیفۂ ولا (مجموعۂ قصائد) صدیق بکڈپو لکھنؤ ۱۹۳۰ء

۱۰۔ عزیز اللغات انوار احمدی پریس الہ آباد، سنِ اشاعت ندارد

۱۱۔ قصائدِ عزیز معیار پریس رستم نگر لکھنؤ ۱۹۱۴ء

۱۲۔ گلِ تابوت مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۹۱۸ء

۱۳۔ گلکدہ (دیوان) صدیق بکڈپو لکھنؤ ۱۹۳۱ء

۱۴۔ لعلِ شب چراغ (قصیدہ ایک کتابچہ کی شکل میں) اے آئی، آئی پرنٹنگ ورکس لکھنؤ، سنِ اشاعت ندارد

۱۵۔ ہلالِ جرس (قومی نظموں کا مجموعہ) نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء

۲- دیگر کتب (ماخذ)

۱۶- آبِ حیات، محمد حسین آزاد- پنجاب پریس لاہور- لاہور سنہ ۱۹۵۰ء
۱۷- آئینۂ بلاغت- محمد عسکری- یونائٹڈ یا پریس نیا گاؤں لکھنؤ سنہ ۱۹۳۷ء
۱۸- اثرستان (دیوان) جعفر علی خاں اثر لکھنوی- نظامی پریس لکھنؤ- سنہ ۱۹۳۴ء
۱۹- ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، اسرار کریمی پریس الہ آباد سنہ ۱۹۶۵ء
۲۰- ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نظامی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۷۲ء
۲۱- اردو ادب، آزادی کے بعد، ڈاکٹر اعجاز حسین، اسرار کریمی پریس الہ آباد سنہ ۱۹۶۰ء
۲۲- اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر، ڈاکٹر عبد العلیم، کمال پرنٹنگ پریس دہلی، سن اشاعت ندارد
۲۳- اردو تنقید کا ارتقاء، ڈاکٹر عبادت بریلوی، محبوب المطابع برقی پریس دہلی سنہ ۱۹۴۹ء
۲۴- اردو تنقید پر ایک نظر- کلیم الدین احمد- سرفراز قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۹ء
۲۵- اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد دی آزاد پریس پٹنہ سنہ ۱۹۶۴ء
۲۶- اردو غزل- ڈاکٹر یوسف حسین معارف پریس، اعظم گڑھ سنہ ۱۹۷۴ء
۲۷- اردو غزل کے پچاس سال ڈاکٹر عبد الاحد خاں خلیل نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۷ء
۲۸- اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی، جمال پریس دہلی سنہ ۱۹۷۳ء
۲۹- اردو میں قصیدہ نگاری، ڈاکٹر ابو محمد سحر، انوار صفدر پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۵۸ء
۳۰- " " " نظامی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۶ء
۳۱- اردو میں قومی شاعری کے سو سال، سید علی جواد زیدی پرنٹنگ اسٹیشنری اترپردیش الہ آباد سنہ ۱۹۵۹ء
۳۲- ارمغانِ حُب، راجکمار محمد امیر حیدر خاں، حُب آف محمود آباد وقیمہ پریس بمبئی سنہ ۱۹۳۹ء
۳۳- اسبابِ بغاوت ہند، سر سید احمد خاں، محبوب المطابع برقی پریس- دہلی سنہ ۱۹۷۱ء
۳۴- انتخاب زریں، ڈاکٹر سید راس مسعود نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۳۶ء
۳۵- انتقادیات- نیاز فتحپوری مشہور آفسیٹ پریس- کراچی سنہ ۱۹۵۹ء

۳۶ - انشائے ماجد (جلد دوم) عبدالماجد دریابادی شاہی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۱ء

۳۷ - بازارِ سخن۔ مہذب لکھنوی نظامی پریس۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۵۱ء

۳۸ - بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں، مرزا جعفر حسین نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۷۸

۳۹ - بیخود موہانی۔ حیات اور شاعری، سید سکندر آغا، نامی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۷۴ء

۴۰ - تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری مطبع منشی نولکشور۔ لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۲۹ء

۴۰ - تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ سنہ ۱۹۳۰ء

۴۱ - تاریخ نظم اردو (منظوم) ناطق لکھنوی ظفر المطابع - لکھنؤ سنہ ۱۹۴۱ء

۴۲ - ترجمہ تکملۂ نجوم السماء، مرزا محمد مہدی (برادرِ عزیز) مکتبہ بصیرتی قم، ایران سنہ ۱۳۹۷ھ

۴۳ - تنقید و تجزیہ، ڈاکٹر ابو محمد سحر، اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد سنہ ۱۹۶۱/۶۲ء

۴۴ - تنقید و تحلیل، پروفیسر سید شبیہ الحسن، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۵۸ء

۴۵ - تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور فروغ اردو لکھنؤ سنہ ۱۹۵۵ء

۴۶ - تنقیدی جائزے، سید احتشام حسین، سرفراز پریس۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۷۰ء

۴۷ - تنقیدیں ادریس احمد ادیب اردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سنہ ۱۹۴۴ء

۴۸ - تنقیدی نظریات، سید احتشام حسین، سرفراز پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۶ء

۴۹ - جدید اردو تنقید اصول و نظریات ڈاکٹر شارب ردولوی نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۸ء

۵۰ - چکبست۔ حیات اور ادبی خدمات ڈاکٹر افضال احمد، سرفراز پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۷۵ء

۵۱ - حقیقتِ اولیاء، حیات مرشد صوفی باصفا منظر لکھنوی، مکتبہ عین القضاۃ لکھنؤ سنہ ۱۹۲۵ء

۵۲ - خزینۂ سخن مرتبہ مصور سبزواری سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ، لکھنؤ سنہ ۱۳۸۲ھ

۵۳ - خطباتِ آزاد، ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام۔ جمال پریس، دہلی سنہ ۱۹۷۴ء

۵۴ - خمخانۂ جاوید لالہ سری رام (جلد چہارم) ہمدرد پریس دہلی سنہ ۱۹۲۶ء

۵۵ - دو ادبی اسکول، سید علی جواد زیدی، ہمتا پرنٹنگ پریس۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۷۰ء

۵۶- دیوان جی ظریف لکھنوی، مرتبہ صفی لکھنوی، الواعظ پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۴۹ء
۵۷- دیوان غالب۔ مرزا غالب، اسرار کریمی پریس، الہ آباد سنہ ۱۹۶۰ء
۵۸- دیوان میر۔ میر تقی میر۔ مطبع منشی نولکشور۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۲۲ء
۵۹- رس (مجموعۂ رباعیات) شیام موہن لال جگر بریلوی شاہی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۰ء
۶۰- روحِ رواں (شعری مجموعہ) جگت موہن لال رواں اناوی، نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۹ء
۶۱- روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری، نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۳۷ء
۶۲- شعر الہند (حصہ اول) مولانا عبدالسلام ندوی، مطبع معارف، اعظم گڈھ سنہ ۱۹۴۲ء
۶۳- شعرائے اتر پردیش (تذکرہ) حصہ اول، عرفان عباسی، نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۸۲ء
۶۴- شہرتِ کاذبہ۔ یاس، یگانہ چنگیزی، اصح المطابع۔ لکھنؤ سن اشاعت ندارد
۶۵- صحیفہ (حالات صفی) سید زائر حسین کاظمی، سرفراز پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۷۴ء
۶۶- صحیفۃ الغزل (دیوان صفی) سید علی نقی صفی لکھنوی، سرفراز پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۵۳ء
۶۷- طوفانِ محبت (مثنوی) ہوش بلگرامی، دار الطبع سرکارِ عالی حیدرآباد دکن سنہ ۱۹۴۶ء
۶۸- علمائے حق (حصہ اول) مولانا سید محمد میاں کوہ نور پریس، دہلی سنہ ۱۹۳۹ء
۶۹- عندلیب تواریخ، خان بہادر سید مسعود حسن مسعود، اسرار کریمی پریس الہ آباد سنہ ۱۹۶۳ء
۷۰- فانی۔ حیات اور شاعری، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، سرفراز پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۹ء
۷۱- خیر المذکورین فی الکتاب ضمیمہ، مولانا مفتی ابوالقاسم فرنگی محلی۔ غیر مطبوعہ۔ مملوکۂ مولانا حبیب العتیق فرنگی محل، لکھنؤ۔
۷۲- کاروان و منزل، گوپی ناتھ، امن دلی پرنٹنگ ورکس دہلی سنہ ۱۹۵۰ء
۷۳- کاروانِ ادب، ڈاکٹر عبدالوحید، شعبۂ تالیفات فیروز سنز لاہور سنہ ۱۹۴۱ء
۷۴- کاشف الحقائق (حصہ اول و دوم) مولوی امداد امام اثر، مکتبہ معین الادب لاہور سنہ ۱۹۵۶ء
۷۵- گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر لکھنوی۔ نظامی پریس، لکھنؤ۔ سنہ ۱۹۷۴ء

۷۶۔ کلبانگ سحر مرتبہ سندر لال پروانہ محبوب المطابع جامع مسجد دہلی سنہ ۱۹۶۵ء

۷۷۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، نظامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۷۳ء

۷۸۔ " " " " یونین پریس دہلی۔ دہلی سنہ ۱۹۷۳ء

۷۹۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، نظامی پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۷۸ء

۸۰۔ مالۂ وماعلیہ نیاز فتحپوری نگار بک ایجنسی لکھنؤ سنہ ۱۹۴۸ء

۸۱۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین، سرفراز پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۵ء

۸۲۔ سوانح حیات حضرت مولانا عین القضاۃ مولوی حافظ محمد افتخار علی نامی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۴ء

۸۳۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔
مسلم ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ سنہ ۱۹۶۱ء

۸۴۔ مرقع ادب، صفدر مرزا پوری، مجتبائی پریس۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۲۷ء

۸۵۔ مسلمانوں کے افلاس کا علاج، رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڈھ سنہ ۱۹۳۴ء

۸۶۔ مشاطۂ سخن، صفدر مرزا پوری، ملیتھوڈسٹ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ سنہ ۱۹۲۷ء

۸۷۔ مضامین چکبست، پنڈت برج نرائن چکبست، کتبہ علی حسین لکھنؤ ڈی۔
لکھنؤ، سن اشاعت ندارد

۸۸۔ مقدمۂ شعر وشاعری، الطاف حسین حالی، مکتبۂ جامعہ۔ نئی دہلی سنہ ۱۹۶۹ء

۸۹۔ مکاتیب اکبر (مجموعۂ خطوطِ اکبر الہ آبادی بنام عزیز لکھنوی)
ادبی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۲۳ء

۹۰۔ مکتوباتِ سلیمانی (مجموعۂ خطوطِ سید سلیمان ندوی) مرتبہ عبدالماجد دریا بادی
شاہی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۶۳ء

۹۱۔ ناسخ، پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، یونائیٹڈ انڈیا پریس، لکھنؤ سنہ ۱۹۶۴ء

۹۲۔ نبراس النور والضیائی ترجمۂ مصنف نجوم السماء علامہ سید شہاب الدین
مکتبۂ لبصیرتی قم۔ ایران سنہ ۱۹۷۵ء

۹۳- نجوم السماء فی تراجم العلماء۔ مرزا محمد علی (پدر عزیز لکھنوی) مطبع جعفری، نخاس جدید۔ لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء

۹۴- نظم اردو۔ سید قائم رضا نسیم امروہوی۔ نائن پریس، لکھنؤ، سن اشاعت ندارد

۹۵- نقدِ رواں (مثنوی) جگت موہن لال رواں اناوی، نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۵۱ء

۹۶- نئے ادبی رجحانات۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، اسرار کریمی پریس۔ الہ آباد۔ ۱۹۵۷ء

۹۷- واقعاتِ انیس، مہدی حسن، احسن لکھنوی، نظامی پریس۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۵ء

۹۸- ہماری شاعری۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس۔ لکھنؤ۔ ۱۹۲۶ء

۹۹- یادگارِ غالب۔ الطاف حسین حالی، شانتی پریس۔ الہ آباد۔ ۱۹۴۴ء

۱۰۰- یادوں کی برات شبیر حسن جوش ملیح آبادی۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۷۳ء

۱۰۱- یادیں رحم علی الہاشمی، کتاب کار۔ علی گڈھ ۱۹۷۶ء

۳- اخبار و رسائل:-

۱- ادب محمود آباد نمبر دسمبر ۱۹۳۵ء

۲- الناظر لکھنؤ ستمبر ۱۹۱۶ء

۳- الواعظ لکھنؤ نومبر ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۲۵ء تک (عزیز لکھنوی کی ادارت میں نکلے ہوئے کل شمارے)

۴- الہ آباد یونیورسٹی میگزین اپریل ۱۹۵۵ء

۵- اوراق لاہور سالنامہ ۱۹۶۶ء

۶- تسنیم آگرہ جولائی ۱۹۲۳ء سے دسمبر ۱۹۲۳ء

۷- تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ / ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء

۸- حسن ادب لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۶ء اور جنوری ۱۹۲۷ء

۹- خبرنامہ لکھنؤ — اگست ۱۹۸۰ء

۱۰- سرفراز لکھنؤ — ۱۱ نومبر ۱۹۱۱ء، ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۶ء تک (بیشتر شمارے) ۱۹۳۵ء کے نو شمارے، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء سالنامہ ۱۹۳۶ء

۱۱- سہیل علی گڑھ — سالنامہ ۱۹۳۶ء

۱۲- فروغ اردو لکھنؤ — فروری جنوری ۱۹۶۹ء

۱۳- قومی آواز لکھنؤ — ۲۵ جون ۱۹۷۸ء، ۱۳ اگست ۱۹۸۱ء

۱۴- مخزن لاہور — اگست اور نومبر ۱۹۰۹ء، جنوری ۱۹۱۱ء سے دسمبر ۱۹۱۱ء تک

۱۵- معارف اعظم گڑھ — اپریل ۱۹۲۰ء سے اکتوبر ۱۹۲۴ء تک

۱۶- معیار لکھنؤ — ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک کے کل شمارے، ۱۹۱۴ء کے آٹھ شمارے، ۱۹۳۰ء کے دس شمارے، ۱۹۳۱ء کا ایک اور ۱۹۳۲ء کے دو شمارے۔

۱۷- نگار لکھنؤ، پاکستان — دسمبر ۱۹۵۲ء، سالنامہ ۱۹۵۷ء، سالنامہ ۱۹۶۶ء

۱۸- نقوش لاہور — سالنامہ ۱۹۶۶ء

۱۹- نیساں (یونیورسٹی میگزین) الہ آباد — جولائی ۱۹۳۵ء

۴- انگریزی کتب اور روزنامے

ENGLISH BOOKS & NEWSPAPERS:

1- BIOGRAPHICAL ENCYCLOPAEDIA OF THE WORLD

INSTITUTE OF RESEARCH IN BIOGRAPHY, NEW YORK.

2- ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM 1960 VOL.1(A-B)
LUZAC & CO. LONDON

3- HISTORY OF URDU LITERATURE- RAM BABU SAXENA,
NATIONAL PRESS ALLAHABAD 1927

4- NATIONAL HERALD
SUNDAY, AUG. 8, 1971 & MARCH 26, 1978

5 PARALLELISM IN ENGLISH & URDU POETS—— S.A. MEHDI
A.R. ALVI PRINTERS LUCKNOW 1965

6- REMINISCENCES RAHM ALI HASHMI,
EXPOSITION RESS U.S.A 1975

7- THE GOLDEN TREASURY-
OXFORD UNIVERSITY PRESS LONDON.

8- THE HINDUSTAN TIMES WEEKLY,
SUNDAY, JUNE 29, 1958 & SEPT 24, 1961

9- THE OVERSEAS HINDUSTAN TIMES,
THURSDAY, NOVEMBER 23, 1961

۵۔ شخصیات

مندرجہ ذیل حضرات سے میں نے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور انھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر عزیز کے سلسلہ میں میرے ذخیرۂ معلومات کو وسعت بخشی۔ شکریہ ابتدائیہ میں ادا ہو چکا ہے۔

شاگردانِ عزیز

۱۔ جناب اعجاز۔ اعجاز حسین دریا بادی (الہ آباد)
۲۔ " حسن۔ سید ابوالحسن کاظمی محمود آباد (سیتاپور)
۳۔ " خنداں۔ مرزا صادق حسین لکھنوی
۴۔ " رحم علی الہاشمی (رہے ذاکر باغ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۵۔ " رنگین۔ باقر حسین۔ لکھنوی
۶۔ " زیدی سید علی جواد
۷ " لیق۔ لیق الزماں لکھنوی

دیگر حضرات

۸۔ جناب ادیب۔ سید مسعود حسن رضوی۔ رٹائرڈ پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ
۹۔ " اشفاق حسین مالک فرم احمد حسین ولدار حسین لکھنؤ
۱۰۔ " اعجاز حسین۔ پراکٹر آفس لکھنؤ یونیورسٹی
۱۱۔ " افسر۔ سید نواب افسر لکھنوی
۱۲۔ " امین سلونوی۔ امین آباد لکھنؤ

۱۳۔ جناب حبیب العتیق (مولانا) فرنگی محل
۱۴۔ " رفیق حسین۔ رٹائرڈ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی
۱۵۔ " سالک۔ سید محمد حسن لکھنوی
۱۶۔ " سعادت حسین (مولانا) پرنسپل شیعہ اربک کالج لکھنؤ
۱۷۔ " سید ابن حسن نونہروی (مولانا) کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ
۱۸۔ " سید اعجاز حسین۔ رٹائرڈ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی
۱۹ " سید ساجد حسین (برادر زادہ مولانا سید ناصر حسین) شاستری نگر۔ لکھنؤ
۲۰۔ " سید علی (مجتہد) کٹرہ ابوتراب خاں۔ لکھنؤ
۲۱۔ " سید علی ظہیر (مولانا) مفتی گنج۔ لکھنؤ
۲۲۔ " سید محمد عقیل رضوی۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی
۲۳۔ " شعلہ سید مومن حسین الہ آبادی
۲۴۔ " ظفر سید ظفر حسن عرف وزن۔ مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ
۲۵۔ " عبدالماجد (مولانا) دریا باد۔ بارہ بنکی
۲۶۔ " عرشی۔ محمد حسن۔ معلم اسلامیہ انٹر کالج۔ لکھنؤ
۲۷۔ " علی حسین۔ محمود آباد۔ سیتاپور
۲۸۔ " فضل نقوی لکھنوی مدیر نظارہ لکھنؤ
۲۹۔ " محمد افتخار علی (حافظ) مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ
۳۰۔ " مسیح الزماں ریڈر الہ آباد یونیورسٹی
۳۱۔ " مہذب لکھنوی۔ مؤلف مہذب اللغات۔ منصور نگر لکھنؤ

AZIZ LUKHNAVI

HIS LIFE & WORKS.

BY

Dr Syed Masood Hasan Rizvi

B. Ed., Dip. T. E., Ph. D. (Goldmedalist)